REGD. L. NO. 7213

Phone: [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1978

[illegible]

فکرِ قرآنی کا پچاس سالہ جشن

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر	بدلِ اشتراک
۲	۸۸۰۸۰۰	سالانہ
دو روپے	خط و کتابت	پاکستان .... ۲۴ روپے
	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور	غیر ممالک .... ۳ پونڈ
شمارہ ۱۲	دسمبر ۱۹۷۸ء	جلد ۳۱

فہرست

۱۔ لمعات ۲
۲۔ روئداد، فکرِ قرآنی کا پچاس سالہ جشن .... (پروفیسر خالد سلام) ۹
۳۔ پمفلٹس، شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۱۵
۴۔ ہدیۂ تشکر و امتنان .... (محترمہ ثریا عندلیب) ۱۸
۵۔ اعلان متعلقہ اضافہ، چندہ مجلہ طلوعِ اسلام ۲۴
۶۔ استقبالیہ۔ فکرِ قرآنی کا جشنِ جوبلی .... (محترم محمد اسلام) ۲۵
۷۔ ایک نئے انداز کا سپاسنامہ .... ڈاکٹر صلاح الدین اکبر) ۳۶
۸۔ میرا سرمایۂ حیات ... خطاب محترم پرویز صاحب ۴۱
بتقریب قرآنی فکر کی پچاس سالہ (گولڈن جوبلی) ....

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ: علمی پرنٹنگ پریس، ۷ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

انگریزی زبان کا ایک محاورہ ہے جس کا اُردو ترجمہ یہ ہے کہ :-

۱- کچھ لوگوں کو آپ ہمیشہ کے لئے دھوکے میں رکھ سکتے ہیں۔

۲- تمام لوگوں کو کچھ وقت کے لئے دھوکے میں رکھ سکتے ہیں ـــــ لیکن

۳- آپ تمام لوگوں کو ہمیشہ کے لئے دھوکے میں نہیں رکھ سکتے۔

ہمارے ہاں مذہب کے نام پر جو سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے اس نے اس محاورہ کی صحت کی تصدیق کر دی ہے۔ ان حضرات نے چاہا کہ تمام لوگوں کو ہمیشہ کے لئے دھوکے میں رکھا جا سکے لیکن واقعات نے بتا دیا کہ ان کی یہ امید موہوم اور کوشش ناکام ہے۔ کچھ وقت کے بعد، حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی اور عوام اس فریب خوردگی سے باہر نکل آئے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے پہلا سوال زیرِ بحث یہ آیا کہ اس ملک میں اس قدر مذہبی فرقوں کی موجودگی میں ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب کیا جائے جسے سب متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ انہوں نے کہا کہ جن لوگوں کی نیت نیک نہیں، وہ ان فرقوں کے باہمی اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہو سکتا ہے اور ہم اسے مرتب کر کے بتا دینگے۔ چنانچہ (۱۹۵۱ء میں) مختلف فرقوں کے علماء پر مشتمل ایک مجلس نے یہ قرارداد پاس کی کہ کتاب و سنت کی بنیاد پر ضابطۂ قوانین مرتب کیا جائے اور اس کے بعد یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ دیکھ لیجئے! تمام فرقوں کے نمائندگان ایک نقطہ پر متفق ہو گئے ہیں اور قوانین سازی کے معاملات میں ان کے باہمی اختلافات مانع نہیں ہو رہے۔ جو لوگ اسے ناممکن بتاتے تھے انہیں شرم آنی چاہیئے۔

لیکن اسے ناممکن کہنے والے بدستور یہ کہتے رہے کہ یہ محض لیپا پوچی ہے۔ جب قانون سازی کا مرحلہ عملاً سامنے آئیگا تو اس وقت اس دعوے کی قلعی کھل جائے گی۔ بیس برس تک یہ حضرات اس دعویٰ کو اچھالتے رہے اور ہر حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہے کہ یہ لوگ چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین رائج ہوں، ورنہ جب مختلف فرقوں کے علماء نے قانون سازی کی ایک متفقہ بنیاد مہیا کر دی ہے تو ایسے قوانین مرتب کرنے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے؟

بیس سال تک ان حضرات نے عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھا، تاآنکہ ۱۹۷۰ء میں مودودی صاحب کو اعلان و اعتراف کرنا پڑا کہ "کتاب و سنت کی بنیادوں پر پبلک لاء کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جو مختلف فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔" (ایشیا ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء) کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ جب اس حقیقت کا آپ کو علم تھا تو آپ (اور دیگر حضرات) نے بیس سال تک قوم کو اس مغالطہ میں کیوں رکھا! نہ ہی کسی نے ان سے یہ پوچھا، اور نہ ہی اس کے بعد یہ کہ جب آپ خود معترف

ہیں کہ پبلک لاء کا کوئی متفق علیہ ضابطہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر مرتب نہیں ہو سکتا تو آپ حضرات اس مطالبہ کو کیوں دہرائے جا رہے ہیں کہ یہاں ضابطہ قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب کیا جائے۔ سوچئے کہ جن لوگوں کی حالت یہ ہو وہ اس مملکت کو اسلامی بنانے کے دعویٰ میں کبھی سنجیدہ ہو سکتے ہیں؟

قانون سازی کے سلسلہ میں یہ حضرات ایک اور مغالطہ بھی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں مختلف فرقوں کے اختلافات بنیادی نہیں، فروعی ہیں۔ مودودی صاحب نے اگلے دنوں پاکستان ٹائمز کے ایک نمائندہ کے سوال کے جواب میں کہا تھا:۔

نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کے بارے میں اختلافات کی نوعیت بنیادی نہیں فروعی ہے۔ اسلامی قوانین کی تدوین کے سلسلہ میں جو کوشش ہو رہی ہے وہ حوصلہ افزا ہے۔ اس سلسلہ میں رکاوٹ تعبیر کا مسئلہ ہے۔ یعنی ایک قانون کے بارے میں بعض علماء کی ایک تعبیر ہے۔ اور دوسروں کی دوسری۔ اور یہ مسئلہ ۲۴ گھنٹے میں حل ہونے والا نہیں۔ تعبیر کا اختلاف وقت چاہتا ہے اور یہ بتدریج کے ساتھ حل ہوتا ہے۔ (ایشیا ۵ نومبر ۱۹۷۸ء)

یعنی مودودی صاحب یہ تاثر دینے کی سعی ناکام کر رہے ہیں کہ ان اختلافات کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ یہ محض فروعی اور تعبیری ہیں۔ بنیادی اور اصولی نہیں۔ ہم یہ باور کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتے کہ مودودی صاحب اتنا بھی نہ جانتے ہوں کہ قوانین ہوتے ہی فروعی ہیں یعنی دین کی اصل کے تحت جو جزئیات (فروعات) مرتب کی جاتی ہیں انہیں احکام یا قوانین کہا جاتا ہے۔ باقی رہا تعبیر کا اختلاف تو ہمارے ہاں جس قدر مختلف فقہیں ہیں وہ تعبیر کے اختلافات ہی کی پیدا کردہ ہیں! یہ امید دلانا کہ یہ اختلافات بتدریج مٹ جائیں گے، اگر ابلہ فریبی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ کیا گذشتہ ہزار برس میں تعبیر کا کوئی ایک اختلاف بھی مٹ سکا ہے؟ "چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہیئے"۔ یہ معمولی درجہ کا فروعی اور تعبیری اختلاف ہے۔ کیا آپ شیعوں اور سنیوں میں سے کسی کو بھی اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ اس معمولی سے تعبیری اختلاف کو چھوڑ دیں؟ جب حقیقت یہ ہے تو ان اختلافات کو محض فروعی اور تعبیری کہہ کر یہ تاثر پیدا کرنا کہ یہ قانون سازی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے، دانستہ کتمانِ حقیقت نہیں تو اور کیا ہے؟

بیان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مسئلہ ۲۴ گھنٹے میں حل ہونے والا نہیں۔ آپ پہچانتے ہیں کہ ایسا کہنے والے یہ بزرگوار کون ہیں؟ یہ وہی صاحب ہیں جنہوں نے ۱۹۷۶ء میں (جماعتِ اسلامی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی) وکلاء کانفرنس سے کہا تھا کہ اگر اقتدار ہمیں سونپ دیا جائے تو ہم اگلے ہی روز اسلامی قوانین نافذ کر دیں گے!

بن آئی کی باتیں ہیں۔ جو جی میں آیا کہہ دیا!

(۰)

اب آگے بڑھیئے۔ سالِ گذشتہ (۱۹۷۷ء میں) ان حضرات نے ایک ہنگامہ خیز تحریک اٹھائی۔ ظاہر ہے کہ اس سے مقصد تو حصولِ اقتدار تھا لیکن کہا یہ گیا کہ اس کا مقصد نظامِ مصطفیٰ کا قیام ہے۔ مغالطہ آفرینی کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ جو اصطلاحات استعمال کی جائیں ان کا مفہوم متعین طور پر کبھی نہ بتایا جائے۔ اسلامی نظام۔ نظامِ شریعت۔ نظامِ مصطفیٰ۔ اسی قسم کی اصطلاحات ہیں۔ ان حضرات نے آج تک ان کا متعین مفہوم واضح نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ اگر ان میں سے کسی ایک جماعت نے اس کا مفہوم متعین طور پر بیان کر دیا تو دیگر جماعتیں اسے غیر اسلامی کہہ کر مسترد کر دیں گی۔ اس تحریک کے متذکرہ محاذ میں تین مذہبی جماعتیں نمایاں طور پر شریک تھیں ــــ مفتی صاحب کی جمعیت العلماء اسلام۔ مولانا نورانی صاحب کی جمعیت علماء پاکستان۔ اور مودودی صاحب کی جماعتِ اسلامی۔ ان کے "اسلام" کی کیفیت یہ ہے کہ مفتی صاحب نے ابھی (۱۹۶۹ء میں) مودودی صاحب کو بیانگِ دہل کافر اور خارج از اسلام قرار دیا تھا اور فتویٰ دیا تھا کہ اس کے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی

کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز اور حرام ہے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے" (زندگی مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۶۹ء) جہاں تک مفتی صاحب اور نورانی صاحب کا تعلق ہے وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز تک پڑھنا جائز نہیں سمجھتے حتیٰ کہ نورانی صاحب امام حرم کے پیچھے بھی نماز پڑھنا ناجائز سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم تو پارلیمنٹ کے ایوان میں بھی اپنی نماز الگ پڑھا کرتے تھے۔

آپ سوچئے کہ جن لوگوں کے باہمی اختلافات کی یہ صورت ہو کہ وہ نماز تک میں متفق نہ ہوں وہ کسی نظام کے اسلامی ہونے پر متفق ہو سکتے ہیں؟ جب حقیقت یہ ہے تو پھر نظامِ مصطفےٰ کے مطالبہ پر متفق اور متحد ہونے کا مفہوم اس سے زیادہ کیا ہے کہ یہ لوگ صرف ایک اصطلاح کو متفق طور پر پیش کرتے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس اصطلاح کا مفہوم ان میں سے ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے اور ایک کا مفہوم دوسرے کے نزدیک اسلامی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود عوام کو یہی باور کرانے چلے آ رہے ہیں کہ وہ اس مطالبہ میں بالکل متفق ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ متحدہ محاذ میں شامل جماعتیں الگ الگ پارٹیاں نہیں وہ ایک ہی پارٹی ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے اس دعویٰ کو اپنے ٹی وی کے انٹرویو میں بھی دہرایا تھا (جو حال ہی میں ٹیلی کاسٹ ہوا ہے) ایسا کہتے وقت انہیں اس کا بھی خیال نہ رہا کہ خود متحدہ محاذ (پی۔ این۔ اے) کا نام ان کے دعویٰ کو غلط ٹھہراتا ہے۔ اس کا نام (PAKISTAN NATIONAL ALLIANCE) ہے اور (ALLIANCE) ہمیشہ مختلف جماعتوں میں ہوتا ہے، ایک جماعت میں نہیں۔

لیکن ان حضرات کے اس دعویٰ کی قلعی کھلنے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا۔ محترم صدرِ مملکت صاحب نے ان سے کہا کہ اگر محاذ میں شامل مختلف جماعتیں، ایک جماعت میں مدغم ہو جائیں تو اقتدار ان کے حوالے کیا جا سکتا ہے۔ اب انہیں مشکل آن پڑی کہ کیا کیا جائے؟ ان کے لئے ایک پارٹی میں مدغم ہونا ممکن ہی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ سیاسی پارٹیاں نہیں بلکہ مذہبی فرقے ہیں اور جو فرقے ایک امام کے پیچھے نماز تک نہ پڑھیں وہ ایک فرقہ میں مدغم کس طرح ہو جائیں؟ اس مشکل کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ محاذ میں شامل مختلف جماعتیں سیاسی سرگرمیوں میں تو ایک جماعت کی طرح کام کریں لیکن مذہبی امور میں الگ الگ رہیں۔

مفتی صاحب نے تو اس ثنویت کو مختصر الفاظ میں بیان کیا تھا (پاکستان ٹائمز۔ ۱۰ نومبر ۱۹۷۶ء) لیکن مودودی صاحب نے وضاحت سے اس کی تشریح کر دی۔ اسے نوائے وقت نے اپنی اشاعت بابت ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں ان الفاظ میں شائع کیا ہے:-

پاکستان جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے کہا ہے کہ موجودہ حالات میں ایسی جماعتوں کی بہرحال ضرورت ہے جو مسلمانوں میں دین کا علم پھیلانے کی کوشش کریں۔ ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کیلئے جدوجہد کریں اور انہیں اس اصل حالت کی طرف لے جانے کی تدبیریں کریں جو ابتدا میں مسلمانوں کی تھی۔ مولانا مودودی نے نوائے وقت میں شائع ہونے والے اپنے انٹرویو کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ جس وقت مسلمان دینی اور اخلاقی حیثیت سے تنزل کی حالت میں مبتلا ہوں۔ عام و خواص کی بڑی اکثریت دین سے ناواقف ہو اور قومی زندگی میں طرح طرح کی برائیاں پھیل گئی ہوں، ایسی صورت میں وہ صورتحال یکایک تبدیل نہیں ہو سکتی جو نبی کریمؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں تھی۔ اس وقت بلاشبہ تمام مسلمان ایک ہی پارٹی تھے بلکہ اگر دنیا بھر کے مسلمانوں کی اخلاقی اور دینی حالت درست ہو اور ان میں اسلام کا علم پایا جاتا ہو تو مسلمان ایک عالمگیر پارٹی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

لیکن موجودہ حالت میں ایسی جماعتوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں میں دین کا علم پھیلانے کی کوشش کریں ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے جدوجہد کریں اور انہیں اس اصل حالت کی طرف لے جانے کی تدابیر کریں جو ابتدا میں مسلمانوں کی تھی۔ مولانا مودودی نے کہا کہ اس طرح کی جماعتیں متعدد بھی ہو سکتی ہیں۔ کوئی جماعت تبلیغ عام کرے۔ کوئی اخلاقی اصلاح کیلئے کوشش کرے۔ کوئی دینی علم پھیلانے کے لئے کام کرے اور علیٰ ہذا القیاس جن جن پہلوؤں سے بھی مسلمانوں میں خامیاں پائی جاتی ہوں ان کی اصلاح کے لئے مختلف جماعتیں

> کام کرتی رہیں۔ یہ وہ تفرقہ نہیں ہے جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے۔ بلکہ یہ اس آیتِ قرآنی کے منشا کے عین مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیئے جو نیکی کی طرف بلائے اور برائیوں سے روکے۔ یہ مختلف جماعتیں ملک کے سیاسی نظام کی اصلاح کیلئے مل کر کام بھی کر سکتی ہیں اور اس فرض کیلئے باہم پوری طرح متحد بھی ہو سکتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پھر اس کے ساتھ ساتھ جو دوسرے کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے ہوں وہ بھی سرانجام دے سکتی ہیں۔ مولانا مودودی نے کہا کہ بحالتِ موجودہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک متحدہ پارٹی جو سیاسی مقاصد کیلئے متحد ہوئی ہو وہ ان سارے کاموں کو بھی اپنے دائرۂ عمل میں لے آئے جو مختلف جماعتیں اپنے اپنے طور پر کر رہی ہیں۔

اس سے نہ صرف یہ کہ ان حضرات کے اس دعویٰ کی قلعی کھل گئی کہ یہ سب ایک جماعت ہیں؛ ان کی اس مغالطہ آفرینی کا پردہ بھی چاک ہو گیا کہ ان کے نزدیک مذہب اور سیاست میں ثنویت نہیں۔ اب یہ جماعتیں "سیاسی امور" تو متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم سے طے کریں گی اور "مذہبی معاملات" اپنے اپنے فرقہ کے مسلک کے مطابق الگ الگ! ان سے کوئی پوچھے کہ ان کی طرف سے نظامِ مصطفیٰ کا جو مطالبہ پیش کیا جائے گا وہ سیاسی ہوگا یا مذہبی؟ اگر متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم سے پیش کیا جائے گا تو (خود ان کے فیصلہ کے مطابق) وہ خالصتاً سیاسی ہوگا۔ اور اگر اس کی نوعیت سیاسی نہیں، مذہبی ہے تو پھر اسے متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم سے پیش نہیں کیا جا سکے گا۔ مختلف مذہبی پارٹیاں اپنے اپنے تصور کے نظامِ مصطفیٰ کی تبلیغ الگ الگ کریں گی۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ آگے چل کر ان حضرات کے اتحاد کی سیاسی ہنڈیا بھی کس طرح چوراہے میں پھوٹتی ہے۔ مودودی صاحب نے تو اسلامی جمعیت طلبا سے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ:-

> اب حالات اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ آج نہیں تو چند روز بعد اس کام کو فروغ حاصل ہوگا اور ملک کا انتظام چلانے کا کام بھی آپ کے ذمے لگنے والا ہے۔

(اسلامی جمعیت طلبہ کے سالانہ اجتماع میں مودودی صاحب کا خطاب۔ بحوالہ ایشیا ۵ نومبر ۱۹۷۸ء صفحہ ۵)

ہم تو عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے اس لئے ہمیں ان کی ان رنگ آمیزیوں سے کچھ واسطہ نہیں لیکن اس سے اسلام کا جو حلیہ بگاڑا جا رہا ہے اور اس بدنصیب ملک کا جو حشر ہو سکتا ہے، اس کے تصور سے ہماری روح کانپ اٹھتی ہے اور اس قسم کی نوا گری پر مجبور کر دیتی ہے۔

دل کا خون آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج ۔۔۔ نالہ رو کا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو

———(۰)———

مودودی صاحب نے نوائے وقت میں شائع شدہ (مذکورہ بالا) بیان میں مذہبی جماعتوں سے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے تو ہمیں واسطہ نہیں البتہ اس میں انہوں نے قرآنِ مجید کے حوالے سے جو (یکسر خلافِ قرآن) بات کہی ہے اس پر ہم خاموش رہنا گناہ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ:-

> یہ وہ تفرقہ نہیں ہے جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے بلکہ یہ اس آیتِ قرآن کے منشا کے عین مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیئے جو نیکی کی طرف بلائے اور برائیوں سے روکے۔

ان کا اشارہ قرآنی آیت (۳/۱۰۴) کی طرف ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو مبعوث فرمایا تو حضورؐ کا ایک اہم فریضہ یہ قرار دیا کہ: يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ (۷/۱۵۷) "وہ لوگوں کو معروف کا حکم دیگا اور منکر سے روکے گا"۔ ہم اس مقام پر معروف اور منکر کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے۔ اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ جن امور کو قرآن کریم جائز اور درست قرار دیتا ہے۔ وہ معروف ہیں اور جنہیں وہ غلط اور ناجائز ٹھہراتا ہے وہ منکر ہیں۔ رسول اللہؐ کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔

(۲) لیکن امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ فریضہ تنہا رسولؐ کا نہیں تھا۔ رسولؐ کے ساتھ ایک اُمت کی تشکیل بھی ہوئی تھی اور اس اُمت کا بھی یہی فریضہ قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰) "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کی خاطر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے"۔ اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ ساری کی ساری اُمت کا تھا، نہ کہ اُمت میں سے کسی خاص گروہ کا۔ رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ میں اُمت یہ فریضہ حضورؐ کی سرکردگی میں انجام دیتی تھی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد اُسے یہ فریضہ تنہا سرانجام دینا تھا۔

(۳) قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ یہ فریضہ پوری کی پوری جماعتِ مؤمنین کا ہے۔ کسی خاص گروہ کا نہیں۔ سورۃ التوبہ میں مؤمنین کی مختلف خصوصیات بیان کرتے ہوئے انہیں اَلْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹/۱۱۲) کہا گیا ہے۔ یعنی "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے"۔

(۴) دوسرے مقام پر مؤمنین کے ساتھ مؤمنات کا بھی اضافہ کر کے اس کی وضاحت کر دی کہ یہ فریضہ اُمت کے مرد اور عورتیں سب کے سب سرانجام دیں گے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹/۷۱) "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں"۔

ان تمام آیات میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔ امر کے معنی کسی بات کا حکم دینا ہیں اور نہی کے معنی کسی کام سے حکماً روک دینا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ اسی صورت میں سرانجام دیا جا سکتا ہے جب یہ اُمت صاحبِ اقتدار ہو۔ چنانچہ سورۂ الحج میں ہے کہ: اَلَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲/۴۱) "یہ (مؤمنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہو گا تو یہ اقامتِ الصلوٰۃ۔ ایتائے الزکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے"۔ اس سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت میں اقتدار پوری کی پوری اُمت کو حاصل ہوتا ہے، کسی خاص گروہ کو نہیں۔ دیکھئے ۲۵/۵۵ لہٰذا اس آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر وعظ و نصیحت کی بات نہیں۔ اس فریضہ کو اسلامی مملکت احکام و قوانین کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پوری کی پوری اُمت کا فریضہ ہے نہ کہ کسی خاص گروہ کا۔ اور اُمت اس فریضہ کو اقتدارِ مملکت کی رو سے سرانجام دیتی ہے نہ کہ وعظ و نصیحت کے ذریعے۔ اسلام کے صدرِ اوّل میں اس فریضہ کی ادائیگی کی یہی شکل تھی یعنی اُمت اس فریضہ کو اسلامی مملکت کے ذریعے سرانجام دیتی تھی۔ اس زمانے میں اس فریضہ کی ادائیگی کیلئے کوئی الگ گروہ نہیں تھا۔

صدرِ اوّل کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو دین میں ثنویت پیدا ہو گئی جس کے نتیجے میں مذہبی پیشوائیت وجود میں آگئی۔ انہوں نے کہا کہ سیاسی امور تو حکومت سے متعلق ہیں اور "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" ہمارا فریضہ ہے۔ اس کیلئے انہیں کسی سند کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ سند تلاش کر لی اور وہ بھی خود قرآن سے۔ آپ حیران ہوں گے کہ قرآن کریم جو مذہبی پیشوائیت کو مٹانے کے لئے آیا تھا، اس سے اس کی سند کیسے مل سکتی تھی؟ لیکن جب کوئی قرآن کو مسخ کرنے پر اُتر آئے تو اسے اس سے اپنی کونسی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی؟ سُنئے کہ انہوں نے یہ سند کیسے حاصل کی۔

سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت پہلے درج کی جا چکی ہے جس میں جماعت مؤمنین سے کہا گیا ہے کہ "تم وہ اُمت ہو جس کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے"۔ (۳/۱۱۰) اسی سورۃ میں اس سے ذرا پہلے ہے۔ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۰۴) اس کا ترجمہ یوں کر لیا گیا کہ "تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے۔

جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے"۔ اس سے یہ سند لے آئے کہ یہ فریضہ اُمت میں سے ایک خاص گروہ کا ہے اور وہ گروہ علماء یا مذہبی پیشواؤں کا ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر آیا ہے اسے پوری کی پوری اُمت کا فریضہ بتایا گیا ہے۔ اگر آیت (۳/۱۰۴) کا وہ مفہوم لیا جائے جس کے سہارے مذہبی پیشوائیت نے اپنے وجود کی سند مہیا کی تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ ان تمام آیات کو منسوخ قرار دے دیا جائے گا جن میں اسے پوری کی پوری اُمت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر انہیں منسوخ نہ سمجھا جائے تو پھر قرآنِ کریم میں تضاد لازم آئے گا۔ یعنی وہ متعدد آیات میں اسے پوری کی پوری اُمت کا فریضہ قرار دیتا ہے اور ایک آیت میں اُمت میں سے ایک گروہ کا فریضہ۔ یہ کھلا ہوا تضاد ہے جو خود قرآن کے دعویٰ کے خلاف ہے (۴/۸۲) اور جس سے قرآن مجید کی محکمیت ختم ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان حضرات نے یہ مفہوم سے کس طرح سے لیا، جو قرآن کریم کی پوری کی پوری تعلیم کے خلاف ہے؟ آیت کے الفاظ ہیں۔ "وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ"۔ انہوں نے مِنكُم سے فائدہ اٹھایا اور اس کا مفہوم یہ لیا کہ "تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے"۔ عربی زبان کا مبتدی بھی یہ جانتا ہے کہ حرفِ مِنْ کے متعدد معانی میں سے دو معانی نمایاں ہیں۔ یعنی تبعیض اور تبئین۔ تبعیض کے معنیٰ ہوتے ہیں۔ "میں سے" اور تبئین سے مراد ہوتی ہے "پورے کا پورا"۔ عربی لغت کے ماہرین کا قول ہے کہ حرفِ مِنْ کو تبعیض (میں سے) کے معنوں میں صرف اس مقام پر لینا چاہیئے جہاں اس کی جگہ لفظِ "بعض" کو بلا تکلف لا سکیں۔ جہاں ایسی صورت نہ ہو وہاں اس کے معنیٰ تبئین کے لینے چاہیئے۔ (یعنی پورے کا پورا) حوالہ کے لئے دیکھیئے (ــــ اِتقان) جب قرآنِ مجید کی دیگر تمام آیات میں یہ فریضہ پوری کی پوری اُمت کا قرار دیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ ان کی روشنی میں آیت (۳/۱۰۴) میں حرفِ مِنْ کے معنیٰ (بعض) لینے کا کوئی قرینہ ہی نہیں۔ اس کے معنیٰ "پوری کی پوری اُمت" لئے جائیں گے۔ قرآن مجید کی بکثرت آیات میں حرفِ مِنْ کے یہی معنیٰ لئے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسلّمہ ہے جس کے لئے کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے محض اپنے وجود کے اثبات کے لئے اس کے ایسے معنیٰ لئے ہیں جو خود اس قاعدے کے بھی خلاف ہیں اور قرآن مجید کی پوری کی پوری تعلیم کے بھی خلاف۔ اُس زمانے میں کسی ذہن کی اُپج نے یہ اختراع کی اور اس کے بعد اس آیت سے یہی معنیٰ کئے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ اس سے (بزعمِ خویش) مذہبی پیشوائیت کے وجود کی سند مل جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ اس سے ان کے وجود کی سند مل جاتی ہے بلکہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے معنیٰ وعظ و نصیحت کئے جاتے ہیں۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ مملکت خواہ کفّار کی ہی کیوں نہ ہو، وعظ و نصیحت کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضۂ خداوندی ادا ہو جاتا ہے۔ اس سے دین کی ساری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء اسی دلیل کے سہارے یہ کہا کرتے تھے کہ جب ہندوستان کی جمہوری حکومت ہمیں تبلیغِ اسلام یعنی وعظ و نصیحت

---

۱ قرآنِ مجید کا ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔

کی اجازت اور ضمانت دیتی ہے تو اس سے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک جداگانہ مملکت کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے؟

اب یہ حضرات یہاں بھی اسی تصوّر کا اسلام رائج کرنا چاہتے ہیں جس میں سیاسی امور تو اقتدارِ حکومت کی رُو سے سرانجام پائیں اور تبلیغِ دین ——— یعنی اُن کے تصوّر کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ مختلف جماعتیں سرانجام دیں ——— یعنی ہر فرقہ اپنی اپنی صوابدید کے مطابق۔

اس ضمن میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ آیت (۳/۱۰۴) کے آخر میں کہا گیا ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یعنی یہی لوگ فلاح یافتہ ہیں۔ قرآنِ مجید میں مؤمنین کو "مُفْلِحُوْنَ" یعنی فلاح یافتہ کہا گیا ہے۔ ان حضرات نے اس آیت کا یہ مفہوم لے کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر علماء کا فریضہ ہے، یہ بھی ثابت کر دیا کہ مفلحون یہی حضرات ہیں۔ باقی اُمّت فلاح یافتہ نہیں۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پوری کی پوری اُمّت کا فریضہ قرار دیں گے تو اس میں فرقہ بندی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن جب آپ اسے اُمّت میں سے ایک گروہ کا فریضہ قرار دے دیں گے تو پھر اُمّت میں مختلف گروہ پیدا ہو جائیں گے جن میں سے ہر ایک اس کا دعویٰ کرے گا کہ اس فریضہ کی ادائیگی میں وہی حق پر ہے۔ باقی سب باطل پر ہیں۔ یہ جو اُمّت میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے ہیں اور ان میں آئے دن سر پھٹول ہوتی رہتی ہے وہ اسی قسم کے تصوّرات کا نتیجہ ہے۔ قرآنِ کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے پہلے ہی اس سے متنبہ کر دیا تھا۔ چنانچہ آیت (۳/۱۰۴) سے پہلی آیت میں بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ: وَلَا تَفَرَّقُوْا۔ "تم نے تفرقہ نہ پیدا کر لینا"۔ اور اس کے بعد کی آیت میں بھی کہہ دیا کہ: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (۳/۱۰۵) "اور دیکھو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے بیّنٰت (وحیِ خداوندی) کے آجانے کے بعد باہمی اختلاف کیا اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے اور اس طرح وہ بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہو گئے"۔ ——— اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے اور مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ وہ تفرقہ نہیں جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے۔

یاد رکھیے۔ جو نظامِ خداوندی حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں متشکل ہوا تھا، اس میں:۔

(۱) مملکت کے آئین و قوانین کا سرچشمہ قرآنِ مجید تھا۔

(۲) اُمّت، اُمّتِ واحدہ تھی اور فرقہ بندی شرک۔

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ مملکت سرانجام دیتی تھی۔ جس میں تمام اُمّت شریک تھی۔ اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں تھا۔

جب اور جہاں اس شکل کا نظام قائم ہوگا، اسے اسلامی نظام کہا جائے گا۔ باقی سب فریبِ نفس!

(المرقوم - ۲۴ / نومبر ۱۹۷۶ء)

——— (○) ———

خالد سلام
(آئندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور)

فکرِ قرآنی کا پچاس سالہ جشن

(آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک)

جب ادارۂ طلوعِ اسلام نے، ملک کی عام فضا میں ذہنی عدمِ سکون کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن کا انعقاد اس سال پھر ملتوی کیا جائے گا تو ہم وابستگانِ فکرِ قرآنی کے دلوں پر کچھ اوس سی پڑ گئی، کیونکہ جہاں کنونشن اس فکر کی عام نشر و اشاعت کے لئے نہایت مؤثر ذریعہ بنتی ہے اس سے متوسلینِ فکرِ قرآنی کو باہمی ملاقات کا موقعہ بھی میسّر آجاتا ہے اور (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) سینہ چاکانِ چمن ایک بار پھر سینہ چاکانِ چمن سے آملتے ہیں، اور پیامِ محبت کی اس تجدید سے زندگی میں نئے ولولے بیدار ہو جاتے ہیں۔ غالب نے کہا تھا کہ بہرِ وصلِ بتاں ہم مصوری سیکھیں گے اور یہ چیز اُن سے ملاقات کے لئے تقریب کا کام دے گی۔ ہم نے بھی اس باہمی ملاقات کے لئے ایک تقریب کی گنجائش پیدا کر لی اور وہ تقریب تھی فکرِ قرآنی کے پچاس سالہ جشن کی۔ ہم اس تقریب کو اس کے شایانِ شان تزک و احتشام سے منانا چاہتے تھے لیکن مفکرِ قرآن کی کسرِ نفسی اس میں بھی ہمارے آڑے آگئی انہوں نے اس کی افادیت کے پیشِ نظر اپنی رضامندی کا اظہار تو کر دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسے نہایت سادہ طریق سے منایا جائے اور وہ بھی ادارہ (یعنی خود پرویز صاحب کی رہائش گاہ) کے صحن میں ہمیں یہ شرط بھی قبول کرنی پڑی اور طے کیا گیا کہ یہ تقریب ۱۶-۱۷ نومبر کو نہایت سادہ انداز سے منائی جائے۔ عیدالاضحےٰ سے قبل اس سلسلہ میں جملہ انتظامات قریب قریب مکمل کر لئے گئے۔ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب قافلۂ بہار کے ہمیشہ طائرِ پیش رس ہوا کرتے ہیں چنانچہ وہ ۱۲ نومبر کی شام لاہور پہنچ گئے۔ ان کے جذبۂ بے اختیارِ شوق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وقت کی بچت کے خیال سے انہوں نے عید کا دن ٹرین میں گذارا۔ ان کی تشریف آوری سے ہمارے عمل کی رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی۔ ارکانِ کراچی کا قافلہ ۱۵ نومبر کی صبح آپہنچا، اور کوئٹہ کے احباب بھی اسی شام تشریف لے آئے۔ ان حضرات کی آمد سے ادارہ کے ماحول میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ انہوں نے قریب قریب تمام رات پنڈال کی آرائش کے لئے وقف کی اور جب ۱۶ نومبر کا آفتاب طلوع ہوا تو اس نے حیرت سے دیکھا

کہ یہاں ایک نئی دنیا کی نمود ہو رہی ہے۔ وہ دنیا جو اقبالؒ کے الفاظ میں، سنگ و خشت سے نہیں، بلکہ افکارِ تازہ سے وجود میں آیا کرتی ہے۔

طلوعِ سحر کے ساتھ اربابِ شوق کارداں درکارداں ادارہ میں پہنچنے شروع ہو گئے۔ اس قبیلۂ قرآنی کے بزرگِ خاندان، محترم شیخ سراج الحق صاحب نے حسبِ سابق مہمانوں کی رہائش کے لئے اپنا مکان خالی کر دیا تھا۔ واضح رہے کہ پرویز صاحب اور سراج صاحب قریب قریب ساری زندگی ہمدوش و ہمقدم اور دیوار بہ دیوار رہتے چلے آ رہے ہیں۔ ایسے ساتھی بھی دنیا میں کم دیکھنے میں آئے ہوں گے۔ اللہ اس "جوڑی" کو سلامت رکھے۔

اسی طرح ناظمِ ادارہ محترم مرزا محمد خلیل صاحب نے بھی اپنا مسکن مہمانوں کے لئے خالی کر دیا تھا۔ اور خود مفکرِ قرآن کی رہائش گاہ تو اس تحریک کا مستقل مرکز ہے ہی یہ تمام رہائش گاہیں دیکھتے ہی دیکھتے مہمانوں سے پُر ہو گئیں۔ یہ مہمان کوئٹہ سے پشاور اور کراچی سے مردان تک کے طول و عرض سے شاداں و فرحاں تشریف لائے تھے۔ حتیٰ کہ لندن سے، وہاں کی بزم کے نمائندہ، محترم مقصود احمد کیانی صاحب بھی۔ بزم ہائے طلوعِ اسلام کے نمائندگان اور اراکین پر مشتمل پہلا خصوصی اجلاس زیرِ صدارت محترم کیانی صاحب منعقد ہوا۔ بزمِ لاہور ان تقاریب کی میزبان ہوتی ہے اس لئے اس بزم کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ان مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کی سعادت راقم الحروف کے حصہ میں آتی ہے۔ چنانچہ میں نے انہیں نہایت مختصر الفاظ میں خوش آمدید کہتے ہوئے ان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور میزبانی کے فرائض میں ممکن کوتاہیوں کی معذرت چاہی جسے ان کی خندہ پیشانی نے شرفِ پذیرائی عطا فرما دیا۔

محترم شیخ عبدالحمید صاحب ایوانِ ادارہ کے مرکزی ستون ہیں۔ وہ قریب چودہ پندرہ سال سے ان اہم ذمہ داریوں کو اپنی ملازمت کی مصروفیات کے باوجود نہایت حسن و خوبی کے ساتھ سرانجام دیتے چلے آ رہے تھے کہ بالآخر انہوں نے یکسوئی کا فیصلہ کر لیا اور امسال ملازمت سے قبل از وقت پنشن حاصل کر کے اس بلند مقصد کے لئے اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیا۔ چنانچہ جب وہ ادارہ کی سالانہ رپورٹ پیش کرنے کے لئے اسٹیج پر آئے تو جملہ احباب نے ان کی خدمت میں والہانہ ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کیا۔ ادارہ کی یہ رپورٹ یکسر واقعاتی ہوتی ہے اور اعداد و شمار سے مستند۔ اس میں ادارہ کا سال بھر کا "اعمالنامہ" پیش کیا جاتا ہے اور آئندہ سال کے لئے پروگرام کا خاکہ اور اس کی تکمیل کے لئے بزموں سے معاونت کی اپیل۔ یہ رپورٹ بڑی حوصلہ افزا تھی اور حمید صاحب کا حسنِ طلب بڑا امید کوش۔ احباب نے انتہائی انہماک کے ساتھ رپورٹ کو سنا۔ اس کے چند نکات پر اس کے فوری بعد اظہارِ خیال شروع ہو گیا اور طے یہ پایا کہ ان تمام نکات کے لئے آئندہ نشست میں فیصلے کئے جائیں۔

واضح رہے کہ کنونشن چونکہ کم و بیش چار روز پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے اس قسم کے امور پر غور و فکر کے لئے نمائندگان کو کافی وقت مل جاتا ہے۔ لیکن اس تقریب میں وقت کی کمی کی وجہ سے یہ تمام امور کم از کم وقت میں نمٹانے تھے اس لئے ان پر بحث و تمحیص نے طوالت نہ پکڑی اور جملہ نکات قلیل ترین وقت میں نہایت

حسن و خوبی سے طے پا گئے۔ اس کے بعد اجلاس نمازِ مغرب کے لئے برخاست کیا گیا۔

بعد نمازِ مغرب نمائندگان کا دوسرا خصوصی اجلاس زیرِ صدارت محترم ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب منعقد ہوا۔ حسبِ معمول تلاوتِ قرآن مجید کے بعد کاروائی شروع ہوئی تو فیصلہ طلب امور کے متعلق نمائندگان نے نہایت مختصر الفاظ میں اظہارِ خیال کیا۔ چونکہ تحریکِ قرآنی کے اجتماعات میں نہ کسی کو نمود کی خواہش ہوتی ہے نہ منافست کا جذبہ کارفرما، اس لئے جملہ امور بلا جدل و اختلاف نہایت پُرسکون انداز سے طے پا جاتے ہیں۔ جذبہ کارفرما ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس تعاون میں کون کس قدر آگے بڑھتا ہے۔ اس سلسلہ میں نمائندگان نے بیش از بیش جذبہ، ایثار اور سرگرمی کا ثبوت دیا جس سے تحریک میں تازہ تحرّک پیدا ہو گیا۔ یہ اجلاس عشاء کی نماز تک جاری رہا۔

کنونشن میں ایک خصوصی محفل منعقد ہوا کرتی ہے جسے مجلسِ استفسارات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ محفل بڑی پُرکشش، پُرکیف اور بیش بہا معلومات کی حامل ہوتی ہے۔ سامعین اپنے اپنے سوالات پیش کرتے ہیں اور مفکرِ قرآن اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق ان کے برجستہ جوابات دیتے ہیں۔ یہ محفل اس قدر پُرکشش ہوتی ہے کہ شرکاء کو اس کے اختتام کے فوری بعد آئندہ محفل کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ موجودہ تقریب میں وقت کی کمی کی وجہ سے پروگرام میں اس محفل کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن احباب نے شدت سے تقاضا کیا کہ انہیں اس سے یکسر محروم نہ رکھا جائے۔ زیادہ وقت نہیں تو تھوڑے سے وقت کے لئے ہی سہی اس کا انعقاد ضرور کیا جائے۔ چنانچہ اسی شب یہ محفل بھی منعقد ہوئی اور کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فضا میں پھیل کر قلوب و اذہان کو مالا مال کر گئیں۔ احباب کی زندگی بخش مسرتوں کے ساتھ یہ پُرکیف محفل اختتام تک پہنچی، اور ان شب بیداروں نے باقی رات باہمی "گپ شپ" میں گذاری۔ پھر یہ صبح کی نماز کے بعد کھلے اجلاس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

کھلے اجلاس کے آغاز کا وقت 9 بجے تھا لیکن ہوا یہ کہ اس سے بہت پہلے سارا پنڈال قریب قریب پُر ہو گیا۔ اور جب اجلاس شروع ہوا تو اربابِ ذوق کی ایک خاصی تعداد باہر کے گیٹ تک کھڑی تھی۔ ہمیں ان کی اس زحمت کا بدرجہ غایت احساس تھا لیکن تلافی کا کوئی سامان ہمارے پاس نہیں تھا — جب اجتماع دیواروں سے محدود ہو تو پھر اس میں وسعت کیسے پیدا ہو سکے؟

یہ اجلاس میجر جنرل (ریٹائرڈ) —— محمد نواز ملک کی زیرِ صدارت ٹھیک نو بجے شروع ہو گیا۔ تلاوتِ قرآن مجید اور منظوم پیغامِ اقبالؒ کے بعد بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے نمائندہ محترم محمد اسلام صاحب نے استقبالیہ پیش کیا۔ یہ استقبالیہ اپنے الفاظ کی شکل میں اسی اشاعت میں آپ کے سامنے آجائے گا لیکن اس نے جو کیفیت پیدا کی تھی اُسے تو الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔ سامعین کے جذب و انہماک کا یہ عالم تھا کہ کسی گوشہ سے اونچی آواز تک کی آواز سنائی نہ دیتی، اور یہ سکوت صرف اس وقت ٹوٹتا جب بعض مقامات پر جوشِ مسرت قلب کے پیمانوں سے چھلک کر باہر آجاتا —— اور اُس وقت اور

گہرا ہو جانا — جب مقرر اور سامعین دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتیں — یہ استقبالیہ اُن کے پیش کرنے کا انداز اور اس کے تاثرات کی کیفیت مُدتوں یاد رہے گی۔

بزمِ خواتین لاہور کی نمائندہ، ہماری قابلِ احترام بہن، ثریّا عندلیب جہاں فہمِ قرآنی میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں وہاں اس کے پیش کرنے کا ان کا انداز بھی اپنا ہے۔ انہوں نے اپنے اسی مخصوص انداز سے ہدیۂ تشکّر کے عنوان سے ایک مختصر سا مقالہ نذرِ سامعین کیا جس نے فضا کا رنگ بدل دیا۔ یہ مقالہ بھی طلوعِ اسلام کے اوراق میں آپ کے سامنے آجائے گا۔

اور اس کے بعد وہ لمحہ آگیا جس کے انتظار میں وابستگانِ فکرِ قرآنی اور دیگر اربابِ ذوق نے انتظار کی گھڑیاں بڑے ہی صبر و تحمل سے گذاری تھیں۔ یعنی خود مفکرِ قرآن اسٹیج پر تشریف لے آئے۔ انہوں نے اپنا خطاب تو پہلے سے قلم بند کر دیا تھا۔ ادارہ کی طرف سے اس کا پمفلٹ بھی چھپوا لیا گیا تھا لیکن انہوں نے جو خطاب پیش کیا، یوں سمجھئے کہ اس میں اس مطبوعہ خطاب کے عنوانات ہی سامنے آئے، باقی انہوں نے سب کچھ برجستہ پیش کیا۔ میں کیا کہوں اور کن الفاظ میں کہوں کہ انہوں نے کیا کچھ کہا اور کس انداز سے کہا؟ میں تو اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ خوش بخت تھے وہ اربابِ ذوق جو بذاتِ خود اس سے کیف یاب ہوئے اور حرماں نصیب تھے جو اس سے محروم رہ گئے۔ اس قسم کی ساعتیں زندگی میں بار بار نہیں آیا کرتیں۔ قریب تین گھنٹے پر مشتمل یہ خطاب، جس میں کبھی بحرِ ذخّار کی تلاطم خیزیاں تھیں اور کبھی جوئے نغمہ بار کی سی پُرسکوت روانیاں۔ کبھی آنکھوں کے پیالوں سے بے ساختہ چھلک پڑنے والے قطراتِ اشک اور کبھی تحسین و تبریک کے ولولہ انگیز نعرے — پرویز صاحب، اپنی فکرِ قرآنی کی پچاس سالہ زندگی میں جن وادیوں سے گذرے ہیں انہوں نے ان کا نقشہ اس انداز سے کھینچا کہ ان کے حسین و جمیل مناظر ایک ایک کر کے، پردۂ سیمیں پر نمودار ہونے والی رنگین فلم کی طرح باعثِ فروغِ دیدہ اور وجۂ بالیدگیٔ قلب و دماغ ہوتے گئے، جاذبیت کا یہ عالم کہ گھڑیاں بھی چلنا بھول گئیں اور وقت کا احساس اس وقت بیدار ہوا جب مقرر نے کہا کہ مجھے اپنے خطاب کو سمیٹنا چاہیئے کیونکہ جمعہ کی نماز کا وقت قریب آرہا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ تین گھنٹے کا وقت گذر چکا ہے اور نہ ہی یہ سننے کے لئے آمادہ کہ یہ خطاب جلدی اختتام پذیر ہو جائے گا۔ لیکن نماز کے تقاضا کی بنا پر ایسا کرنا ہی پڑا، اور سامعین کو با صد دلِ ناخواستہ پنڈال سے رخصت ہونا پڑا۔ میں تو اس کے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جہاں یہ جوبلی اپنی نوعیت کی منفرد تقریب تھی وہاں پرویز صاحب کا یہ خطاب بھی ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی، صحت اور فکر کو لامتناہی برکات سے نوازے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جمعہ کی نماز کے بعد ایک نہایت حسین و سادہ تقریب منعقد ہوئی جس میں وابستگانِ فکرِ قرآنی کی طرف سے محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب نے پرویز صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ اس تقریب کی طرح، اس سپاسنامہ کا انداز بھی نرالہ تھا اور ڈاکٹر صاحب کے مخصوص اسلوبِ بیان کا نہایت خوبصورت

مظہر، جس سے محبت اور احترام کے گہرے جذبات کسی قسم کے تکلّف کے بغیر سیدھے دل میں اُتر جانے والے سادہ الفاظ میں پیش کئے گئے۔ یہ سپاسنامہ زینت دہِ اوراقِ طلوعِ اسلام ہو جانے کا۔ ڈاکٹر صاحب کے سپاسنامہ کے بعد مختلف احباب نے بھی مختصر الفاظ میں اپنے جذباتِ محبت و احترام کا اظہار فرمایا۔ بہت سے اور دوست بھی اس میں شرکت چاہتے تھے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ایسا نہ کیا جا سکا جس کے لئے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں۔

اور اس کے بعد ایک ایسا منظر سامنے آیا جو ہمارے لئے بالکل خلافِ توقع اور حیران کن تھا۔ یعنی پرویز صاحب، جو اقلیمِ سحر بیانی کے گویا سروش ہیں، ہمارے سامنے ساکت و صامت کھڑے تھے۔ آنکھوں میں آنسو۔ طغیانیِ جذبات کے خاموش آئینہ دار اور ہونٹ ایک لرزشِ خفی کے غماز۔ بصد مشکل اتنا کہہ سکے کہ حضرت مولانا نے کہا تھا:۔

اب ان سے کہو آرزوئے شوقِ نالِ حسرت! وہ سحرِ بیاں آج کہاں گم ہے تمہارا؟

"کبھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ایسا موقع کونسا ہو سکتا ہے؟ اس وقت نہ صرف یہ بات سمجھ میں آئی بلکہ خود آپ بیتی بن گئی۔ الفاظ جو میرے سامنے ہمیشہ اشارہ کے منتظر کمربستہ کھڑے رہتے تھے جذبات کے تلاطم میں گم ہو چکے ہیں اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آپ احباب کے ان بے پناہ جذباتِ محبت کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔ بصد مشکل کہہ سکتا ہوں تو فقط اتنا کہ:۔

یک نگاہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک بہرِ پیمانِ محبت نیست سوگندے دگر"

اور جب وہ چند الوداعی الفاظ کہہ کر، خاموشی سے ہاتھ اٹھا کر سلام کے بعد پیچھے مڑنے لگے تو ان کی پلکوں پر آنسوؤں کے ستارے چمک رہے تھے اور ان کے احباب کسی گہری سوچ میں گم —— دونوں طرف سے یہ بے پناہ خاموشی حساس قلوب کو نمعلوم کس کس قسم کے خیالات کی آماجگاہ بنا رہی تھی

اس اجتماع میں شریک سامعین کو پنڈال میں ایک ایسی جدّت نظر آئی جس کی نظیر اس سے پہلے سامنے نہیں آئی تھی اور یہ نتیجہ تھا محترم اسلام صاحب کے نادرہ کار ذہن کی تخلیقی صلاحیت کا۔

جیسا کہ معلوم ہے فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کا ایک مؤثر ترین ذریعہ پرویز صاحب کے مقالات و خطابات پر مشتمل پمفلٹس ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں۔ پمفلٹوں کا یہ سلسلہ طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل (زمانہ قبل از تقسیمِ ہند) میں شروع ہوا تھا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد گذشتہ تیس سال سے مسلسل جاری ہے۔ یہ پمفلٹ اتنی تعداد میں شائع ہوئے کہ ہمارے ذہنوں میں ان کے نام تک محفوظ نہیں۔ اسلام صاحب کی کاوشوں نے ان تمام پمفلٹوں کو (جو کم از کم اڑھائی سو کی تعداد میں تھے) ڈھونڈ نکالا اور انہیں تاریخ وار ترتیب سے بڑے بڑے بورڈوں پر حسنِ ترتیب کے ساتھ چسپاں کر کے ان بورڈوں کو پنڈال میں اس انداز سے آویزاں کیا کہ یہ ناظرین کے دل میں یہ محیر العقول تاثر پیدا کرتے تھے کہ مفکرِ قرآن نے علاوہ دیگر امور، ان پمفلٹوں کی شکل میں بھی کس قدر عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ خرد ان کی اس خارہ شگافی پر محوِ حیرت تھی اور حساس قلوب ان کی اس محنتِ شاقہ پر تحسین و تبریک

کے پھول نچھاور کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر بلا قیمت تقسیم ہوا۔ اس سے آپ اندازہ فرما لیجئے کہ طلوعِ اسلام کے اس بے سازوسامان ادارہ نے فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت میں کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ میں نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ جملہ وابستگانِ فکرِ قرآنی کی طرف سے محترم محمد اسلام صاحب کی خدمت میں ان کی اس مایۂ ناز کاوش پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے ان بھولی ہوئی حقیقتوں کی کیسے حسین انداز سے یاد تازہ کرائی ہے —— دو اڑھائی سو کے قریب مختلف موضوعات پر پمفلٹ —— زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جو ان کے احاطہ سے باہر رہ گیا ہو۔ ان کی فہرست آئندہ صفحات میں سامنے آجائے گی۔

——(۰)——

کھانے کے بعد وہ سادہ اور رنگین محفل منعقد ہوئی جس کے لئے سب ہمہ تن انتظار تھے۔ یعنی شعر و نغمہ کی دلآویز محفل۔ سیالکوٹ کے رہنے والے محترم نذیر فاروقی صاحب کو فطرت نے بڑی نادرہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وہ کلامِ اقبالؒ کو خوب سمجھتے ہیں۔ انہوں نے مختلف موضوعات کے اعتبار سے، یوں کہیئے کہ اپنے ذہن میں ان کی تبویب بھی کر رکھی ہے۔ انہیں لحنِ داؤدی عطا ہوا ہے اور کلاسیکی موسیقی میں انہیں بڑا گہرا ادراک حاصل ہے۔ ان تمام صلاحیتوں کے ہمدوش جب وہ ساز کی ہم آہنگی سے کلامِ اقبالؒ پیش کرتے ہیں تو، مومن کے الفاظ میں، شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو —— انہوں نے اس محفل میں وہ کیفیت پیدا کی کہ عرصہ تک اس کی یاد بھلائی نہیں جا سکے گی۔ جشنِ جوبلی کے منتظمین کے اس حسنِ انتخاب پر سامعین کی طرف سے دل کھول کر داد دی گئی اور ان کے "ہاں اور" کے بے پناہ تقاضا پر بصد مشکل قابو پانے کے بعد اسے ختم کرنا پڑا۔ ازاں بعد احباب ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر اپنی اپنی آرام گاہ کی طرف لوٹ گئے کہ انہیں علی الصبح رخصت ہو جانا تھا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے کہ پرویز صاحب نے یہ قدغن عائد کر دی تھی کہ اس تقریب کو نہایت سادگی سے منایا جائے لیکن تجربہ نے بتایا کہ اگر ولولۂ شوق بیدار ہو اور ذہنوں میں حسنِ ترتیب تو سادگی میں بھی وہ ملاحتیں پیدا کی جا سکتی ہیں جس پر ہزار رنگینیاں نثار ہو جائیں۔ میں اس روئداد کو اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ جس سرچشمۂ حسن و خوبی کے تصدق ہمیں یہ سب کچھ حاصل ہو رہا ہے ... اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ خضر عطا فرمائے اور ان کی صحت اور توانائی فکر میں دن دونی رات چوگنی ترقی فرماتا چلا جائے۔ اربابِ ذوق میں سے کون ہے جو میری دل سے ابھرنے والی اس دعا پر آمین نہیں کہے گا؛ اس لئے کہ اس دعا میں خود ہماری "خود غرضی" کا بھی تو کچھ کم حصہ نہیں !!

والسلام

ضرورتِ رشتہ

ایک جواں سال فوجی ملازم (جس کی عمر قریب ۳۰ سال ہے) کے لئے کسی بے سہارا دوشیزہ کا رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی پڑھی لکھی، امورِ خانہ داری سے بخوبی واقف ہو اور عمر ۲۵ سال سے کم نہ ہو۔

غ۔ ا۔ معرفت ادارہ طلوعِ اسلام۔
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔

فہرست پمفلٹس شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام

فہرست پمفلٹس

(قبل از تقسیم ہند)

واردھا کی تعلیمی اسکیم

سود اور اسلام۔

مسلم لیگ کا بنیادی مطالبہ۔

زبان کا مسئلہ۔

خدا کی بادشاہت۔

اسلام اور مذہبی رواداری۔

اسلامی معاشرت۔

گفتگوئے مصالحت۔

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد صاحب

مسلمان کی زندگی۔

(یہ فہرست نا تمام ہے کیونکہ اس زمانے کا ریکارڈ تمام محفوظ نہیں۔ طلوعِ اسلام کے فائل البتہ محفوظ ہیں۔)

سنہ ۱۹۴۸ء

مسلم لیگ کو ختم کر دیا جائے۔

سنہ ۱۹۵۲ء

رحمۃ للعالمینؐ

یتیم پوتہ کی وراثت۔

احمدیت اور اسلام۔

سنہ ۱۹۵۳ء

مقامِ محمدی

دینِ خالص

وراثتِ ارض کا ابدی قانون۔

سنہ ۱۹۵۴ء

پیامِ اقبالؒ۔

مقامِ اقبالؒ۔

قرآنک سوشل آرڈر۔

سنہ ۱۹۵۵ء

سنّتِ رسول اللہؐ

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟

سنہ ۱۹۵۶ء

روٹی کا مسئلہ۔

علماء کون ہیں؟

اطاعتِ رسولؐ۔

تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟

بادۂ زندگی۔

انتخاب (جداگانہ یا مخلوط)

دینِ خداوندی۔

مقامِ محمدی (دوبارہ)

سنہ ۱۹۵۷ء

تقدیرِ اُمم کیا ہے؟

قانونِ شریعت۔

جشنِ نزولِ قرآن۔

اندھے کی لکڑی۔

یہ زمین کس کی ہے؟

پاکستان میں قانون سازی کا اصول۔

جشنِ میلاد النبیؐ

قرآن اور تاریخ۔

خمِ زندگی۔

قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر۔

خود فیصلہ کیجئے (کہ اسلام کیا ہے؟)۔

سنہ ۱۹۵۸ء

فرق کیسے مٹ سکتے ہیں؟

من و یزداں۔

رحمۃ للعالمینؐ (دوسرا ایڈیشن)۔

جمع القرآن۔

قرآنی معاشرہ میں کیا ہوگا؟

سنہ ۱۹۵۹ء

CONSTITUTION COMMISSION QUESTIONNAIRE, ANSWERS.

پیامِ فصلِ بہار۔

ہماری تاریخ۔

افواہیں۔

اسلامک آئیڈیالوجی۔

پاکستان میں کوئی بھوکا نہ رہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء

اسلام آگے کیوں نہ چلے؟

قرآن کا سیاسی نظام۔

لغات القرآن کا تعارف۔

معارفِ خرم۔

اسلامی آئین کے بنیادی اصول۔

کتاب و سنت۔

ضبطِ ولادت۔

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

بے بنیاد الزامات اور ان کی حقیقت۔

(۱) پاکستان کی کہانی۔ (۲) خاندانی منصوبہ بندی

WHY DO WE LACK CHARACTER.

۱۹۶۱ء

پاکستان کی کہانی۔

کیا عائلی قوانین اسلام کے خلاف ہیں؟

عورت کی مظلومی۔

وحدتِ ملت۔

مژدۂ صبح۔

مفہوم القرآن کا تعارف۔

القرآن العظیم (مفہوم القرآن کا پیش لفظ)

اسلام ہی کیوں سچا دین ہے!

فردوسِ گم گشتہ۔

اسلامی قوانین کی اصل و بنیاد کیا ہے؟

FUNDAMENTALS OF ISLAMIC CONSTITUTION.

۱۹۶۲ء

اسلام کیا ہے؟

مثالی مملکت۔

کافرگری۔

پرویز صاحب کا خط مفتی شفیع صاحب کے نام

عائلی قوانین۔

نذرِ عقیدت بحضور رسالتمآبؐ۔

شعلۂ نمناک۔

پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ۔

PAKISTAN & ISLAMIC CULTURE

۱۹۶۳ء

قائداعظم کا پاکستان۔

قیامتِ موعود۔

جنگ اور انسان۔

پاکستان کس نے بنایا؟

انسان کے بنیادی حقوق۔

جماعتِ اسلامی خود اپنے آئینہ میں۔

مودودی صاحب اور جمہوریت۔

غلافِ کعبہ۔

۱۹۶۴ء

حرفِ دلنواز۔

معرکۂ دین و وطن۔

قانون کی حکمرانی

مومن کسے کہتے ہیں؟

لمعات (انتخاب جذبات یا عقل)

۱۹۶۵ء

ہم عید کیوں مناتے ہیں؟

جہاد۔

اسلامی مملکت کے فرمانروا۔

۱۹۶۶ء

کمیونزم اور اسلام۔

میرا پیام۔

خدا کی مرضی۔

آرٹ اور اسلام۔

منشورِ آزادی۔

۱۹۶۷ء

ماؤزے تنگ اور قرآن۔

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا۔

اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

احادیث کا صحیح ترین مجموعہ۔

نوائے صبح گاہی۔

انسانیت کا آخری سہارا۔

۱۹۶۸ء

پیامبرِ انقلاب۔

جہانِ دیگر ہے۔

ہندو کیا ہے؟

عالمگیر افسانے جنہیں حقیقت سمجھ لیا گیا۔

۱۹۶۹ء

سوشلزم۔ اسلامی سوشلزم اور اسلام۔

انقلابِ محمدی۔

شرارِ زندگی۔

قرآن کا معاشی نظام۔

ذاتی ملکیت، قرآن کی رو سے۔

اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں

ملازم کا بیان۔

جمہوریت کیسے بحال ہو سکتی ہے؟

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک۔

ECONOMICS IN THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM.

عائلی قوانین میں کیا ہے؟

اساسِ محکم

۱۹۷۰ء

جماعتِ اسلامی کے منشور پر تبصرہ۔

رزق کی محمدی تقسیم۔

اسلامی مملکت کا خواب جو پریشان ہو گیا۔

سکون گھر۔

قوموں کی تقدیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں۔

قدیم اور جدید میں کشمکش۔

قرآنی منشور۔

پاکستان کی پکار۔

فیصلہ کی گھڑی۔

سنہ ۱۹۷۱ء

قرآنی آئین کے بنیادی اصول۔

ہندو کیا ہے؟

خدائی فیصلہ۔

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

نالۂ بے باک۔

سنہ ۱۹۷۲ء

چراغِ آرزو۔

قائدِ اعظمؒ آپ کہاں ہیں؟

اسلامی سوشلزم۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔

معرکۂ دین و وطن (دوسرا ایڈیشن)

نظریۂ پاکستان پر کیا گزری۔

سنہ ۱۹۷۳ء

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

اقبالؒ اور دو قومی نظریہ۔

مساواتِ محمدیؐ۔

اعمال نامہ۔

غلامی سے بدتر ہے بے یقینی۔

جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ۔

سنہ ۱۹۷۴ء

پاکستان کا ازلی دشمن۔

میری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے۔

فرد یا مملکت۔

رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔

اقبالؒ کا مردِ مومن۔

جنسی بدنہادی کا اثر قوموں کی موت و حیات پر۔

تین نمازیں اور تودن کے روزول

کے پس پردہ کیا ہے!

مرزائیت کے نقشِ قدم پر۔

سنہ ۱۹۷۵ء

اقبالؒ اور ختمِ نبوت۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

جہاں مارکس ناکام رہ گیا، اس سے آگے۔

مودودی صاحب کی تفسیر کی چند جھلکیاں۔

وہ ہمارا خواب تھا یہ خواب کی تعبیر ہے۔

فرقہ اہل قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں۔

سنہ ۱۹۷۶ء

دنیا نظامِ محمدیؐ کیلئے بیتاب ہے۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی۔

معمارانِ پاکستان۔

عظمتِ کردار کا گوہرِ تابدار۔

آدمِ نو کی تخلیق۔

ذکر و فکرِ پرویز۔

گہری سازش — پاکستان کے خلاف۔

سنہ ۱۹۷۷ء

قائدِ اعظمؒ اور قرآنِ مجید۔

مودودی صاحب اور بارگاہِ رسالتمآبؐ۔

بارگاہِ قرآنی میں۔

تبویب القرآن۔

نظامِ مصطفےٰؐ۔

یہ آئینہ ہے۔

نظریۂ پاکستان پر کیا گزری؟

اقبالؒ اور دو قومی نظریہ۔

قرآنی آئین کے بنیادی خدوخال۔

قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں۔

خدا کی گرفت۔

انسانیت کا آخری سہارا۔

(دوسرا ایڈیشن)

پاکستان میں اسلامی قانون کیسے بن سکے گا۔

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

مودودی صاحب کا نظریۂ حدیث۔

صرف ایک سوال۔

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک۔

سنہ ۱۹۷۸ء

پاکستان میں سیکولر اسلام۔

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

قرآن مجید کے خلاف گہری سازش۔

اسلامی قوانین کے راستے میں کون حائل ہے۔

آزادی کا پیامبرِ عظیمؐ۔

فکرِ اقبالؒ کا سرچشمہ۔ قرآن

جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ۔

تین اہم موضوعات (خدا اور قیصر، ہماری مسجدیں۔ پارٹی بازی)

فرد یا مملکت۔

قائدِ اعظمؒ اور دو قومی نظریہ۔

حرام کی کمائی۔

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں۔

اسلام میں اجتہاد کی اہمیت۔

اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری۔

میرا سرمایۂ حیات۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔

—(۱)—

(فرمائشیں موصول ہونے پر ان میں سے صرف وہ پمفلٹ بھیجے جا سکیں گے جو اس وقت سٹاک میں موجود ہیں)

ثریا عندلیب

ہدیۂ تشکّر و امتنان

میرے عزیز بھائیو اور بہنو! سلام و رحمت! ۔ آج اپنی اس خوش بختی پر نازاں و فرحاں اس قرآنی پلیٹ فارم سے آپ رفیقانِ قرآنی سے مخاطب ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و استعانت سے آج ہمیں قرآنی جوبلی منانے کی توفیق حاصل ہو رہی ہے، اگرچہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو میرے ان احساسات و جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکیں جو میں جشنِ قرآنی کی اس پاکیزہ روح پرور تقریب کے متعلق اس جگمگاتے موقع پر اپنے قلب و ذہن میں رکھتی ہوں۔

ان یادگار لمحاتِ زندگی میں یقیناً آپ سب کے دلوں کی بھی ایسی ہی طمانیت بخش اور تشکّر آمیز کیفیت ہوگی۔ یہ درست ہے کہ امسال بھی ہم ناسازگاریٔ حالات کے سبب اپنی اہم ترین سالانہ طلوعِ اسلام کنونشن سے محروم رہے ہیں۔ لیکن یہ محرومی ہم درسِ قرآن کے حاملین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی ہمیں تو فی الوقت اس کی جگہ مشیّتِ ایزدی نے ایسی سعادت و برکت سے نوازا ہے کہ اگر ہم نے اسے جانتے سمجھتے ہوئے عملی طور پر اپنا لیا تو نتیجۃً ہمارا حال بھی پُر نور ہوگا اور اس نور سے ہمارا مستقبل بھی نکھرتا اور سنورتا چلا جائے گا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس قرآنی جوبلی کا تعلق ہمارے مشفق و محترم معلم مفکرِ قرآن باباجی کی اس پچاس سالہ بیش بہا زندگی سے ہے جو ان کی قرآنی فکر اور اس کی نشر و اشاعت پر محیط ہے جس کی اہمیت و حیثیت خود ان کی زبان میں سنیئے! فرماتے ہیں۔ "میرے نزدیک یہ پچاس سالہ 'جوبلی' دنیا کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور اس کی یاد سب سے زیادہ وجۂ نشاطِ روح ہے"۔ بلاشک و شبہ ایسی عظیم بات وہی مردِ مومن کہنے کا حق رکھتا ہے جس کا ہر سانس قرآن کی آواز کو دنیا میں بلند کرنے کے لئے آتا ہو اور جس کی زندگی کا ہر لمحہ تعلیماتِ قرآنی پر غور و تدبّر کر کے انہیں معاشرے میں عام کرنے کے لئے وقف ہو۔ ہم نے اپنے باباجی کی مدّت العمر محنت و کاوش کے ماحصل سے جو جو کچھ حاصل کیا ہے اور مسلسل درسِ قرآن سنتے رہنے اور اسے اپنے دل میں اتارتے رہنے کی بدولت ہمارے اندر جو نفسیاتی تغیّر اور ذہنی انقلاب رونما ہوا ہے کیا ہم اس کے لئے باباجی کو خراجِ تحسین پیش کر کے ان کا حق ادا کر سکتے ہیں؟ میں سمجھتی ہوں، ہم یہ حق ادا نہیں کر سکتے تاوقتیکہ ہم اپنے کردار و اعمال کی صورت میں وہ کچھ نہ بن جائیں جو کچھ قرآنِ حکیم ہمیں بنانا چاہتا ہے۔ اور اس سلسلے میں ہم دیکھتے

ہیں کہ اس ایک شخص نے جسے پرویز کہتے ہیں تن تنہا اس علمی تحقیقاتی اور فکری قرآنی پروگرام کی تکمیل کے لئے بیسیوں ضخیم تصانیف، ہزاروں صفحات طلوعِ اسلام، سینکڑوں خطابات و تقاریر نہ صرف اس امتِ مسلمہ بلکہ دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کی ہیں اور یہ سلسلۂ رشد و ہدایت برابر جاری ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہمت و استقامت کا پیکر بن کر ہی یہ عمیق گھاٹی عبور ہوتی ہے اور صد ہزار آفریں ہے اس جویائے صراطِ مستقیم اور طالبِ علمِ قرآنِ حکیم پر جس نے نصف صدی سے حقائقِ قرآنی کو سمجھنے اور سمجھانے کی حیات آفریں ذمہ داری اٹھا رکھی ہے اور اس پیرانہ سالی تک پہنچ جانے کے باوجود فکرِ قرآنی کے راستے کے موانعات دور کرنے کے لئے ان کی جگر سوزی اور نفس گدازی میں شمہ بھر کمی نہیں آئی۔ ماہ جولائی ۱۹۷۸ء میں اپنی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ہمارے باباجی نے طلوعِ اسلام میں ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" کے عنوان سے اپنے تاثرات رقم کئے۔ اس تحریر دل پذیر کا ایک اقتباس سنیئے اور جھوم جایئے۔ لکھتے ہیں۔" یہ کچھ میں نے کیسے کر لیا۔ سچ پوچھئے تو منطقی توجیہات سے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب میں خود بھی نہیں دے سکتا۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بے صوت ان دیکھی صدا مجھے بلاتی گئی اور میں این و آں سے بے گانہ والہانہ طور پر اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس میں تھکنا تو ایک طرف میں کبھی سستانے کے لئے بھی نہیں رکا۔ بجز ان لمحات کے جن میں میں (علالت وغیرہ کی وجہ سے) بالکل معذور ہی نہ ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے وقف رکھا۔ اس آواز میں کوئی ایسا سحر تھا کہ میں رک سکتا ہی نہیں تھا۔ یہ آواز خدا کی کتابِ عظیم قرآنِ کریم کی تھی جس کے ساتھ میرا قلبی لگاؤ عشق کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس میں کوئی عنصر فوق الفطرت نہیں تھا۔ نہ ہی مجھے اس کا کوئی دعویٰ ہے۔ میں نے اس تذکرہ کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ جو متجسس قلوب میرے اس حاصلِ کشت کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھیں ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس میں کوئی بات غیر معمولی یا فوق البشر عنصر نہیں۔ انسان کے اندر اتنی بے پناہ صلاحیتیں مضمر ہیں جن کا اسے خود بھی علم و احساس نہیں ہوتا۔ اگر کسی مقصد کے ساتھ عشق کی حد تک لگاؤ پیدا ہو جائے تو یہ صلاحیتیں خود بخود کارفرما ہوتی چلی جاتی ہیں اور ان کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ اس لئے جو کچھ میں نے کیا ہے (بلکہ اس سے بھی زیادہ) ہر شخص کر سکتا ہے بشرطیکہ اپنے مقصد کے ساتھ اسے عشق ہو۔" سامعینِ کرام جس قوم کے افراد کو ایسا دیدہ ور عاشقِ قرآن بطور معلّم ملا ہو کیا وہ افراد اپنے سوختہ بخت اور حرماں نصیب معاشرے کی خود ساختہ تقدیر نہیں بدل سکتے؟ ہمیں تو یہ سکھایا گیا ہے کہ قرآن حکیم مذہبی دنیا کی جنتر منتر کی کتاب یا خالی پند و نصائح کا مجموعہ نہیں۔ یہ وہ ضابطہ، قوانین ہے جس کے مطابق یہ ساری کائنات بہ حسن و خوبی قائم ہے۔ یہ وہ میزانِ عدل ہے جس میں افراد اور اقوام کے ایمان تلتے اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ قرآن تو وہ شمعِ نورانی ہے جو نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتی ہے۔ قرآن تو وہ صداقت ہے جس کی وضاحت سورۂ یونس کی اس آیت میں بہ تمام و کمال مل جاتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ۔ اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے ایک ضابطۂ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کے تمام نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۔ ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں سامانِ نشوونما اور منزل انسانیت تک پہنچنے کی راہ نمائی دیتا ہے۔ یہ ہے وہ ہدایت نامۂ انسانیت یہ ہے وہ ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ جس کے مفہوم مبین پر مذہبی پیشوائیت نے دبیز پردے ڈال رکھے تھے۔ جناب پرویز اپنی جرأتِ ایمانی اور بصیرت قرآنی سے اسے ان پردوں سے باہر نکال لائے اور اس کے ذریعے ہمارے دل و دماغ کے بھی بند دریچے کھولتے چلے گئے۔ ہم نے دلیل و برہان کے ساتھ یہ جان لیا کہ اسلام دین ہے مذہب نہیں ہے۔ یہ دین شروع سے ایک ہی رہا۔ ایک ہی تھا۔ ایک ہی ہے۔ اور قرآن کی دفتین میں محفوظ ہمیشہ کیلئے ایک ہی رہے گا۔ دوسرے تمام مذاہب دین کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ دین اپنی اصلی شکل میں اسلام کے نام سے قرآن کے اندر موجود ہے۔ ہم نے بہ طیب خاطر یہ سمجھ لیا کہ مومن کا ہر سانس، ہر قدم، اس کا ہر ارادہ اور ہر عمل اس مقصد کے لئے ہوتا ہے کہ اس سے خدا کی صفتِ رحمانیت کا دنیا میں ظہور ہو جائے۔ ہمارے سامنے یہ حقیقت آ گئی کہ تسخیر فطرت مقام آدمیت ہے اور ان قوتوں کو وجہ تزئین انسانیت بنانا فریضۂ مومن۔ آدم کے سامنے ملائکہ جھکتے ہیں لیکن مومن کے سامنے ملائکہ اور ابلیس دونوں جھک جاتے ہیں۔ ہمارے معلّم مشفق نے ہمیں یہ روشنی دکھا دی کہ جب ہم قرآن کریم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں تو خدا سے ہمارا تعلق قائم ہو جاتا ہے اور جب ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں تو خدا سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ ہماری ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتے ہیں اور خدا کی رزق پہنچانے کی ذمہ داری ہم اہلِ معاشرہ پر عائد ہوتی ہے جو معاشرہ اس فریضہ کو سرانجام نہیں دیتا وہ خدا کی حفاظت میں نہیں رہتا۔ ہمیں بتا دیا گیا کہ قرآن کریم کا پروگرام تمام نوعِ انسان کو اُمتِ واحدہ بنانا ہے اور وحدتِ اُمت اور اختلافِ عمل دو متضاد چیزیں ہیں۔ جب اُمت میں اختلاف ہونے سے فرقے پیدا ہو جائیں تو وہ اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ زندگی کے ہر شعبے میں قانونِ خداوندی کو سامنے رکھنا، یہ ہے وہ سب سے بڑی قوت جس سے مومنین غلط باتوں کے ارتکاب سے مجتنب رہتے ہیں اس کو ذکر اللہ کہتے ہیں۔ یوں اس رہبر فرزانہ نے قطع نظر اپنی بیش بہا تحاریر کے گذشتہ بیس برسوں کے درسِ قرآن سے ہمارے اذہان و قلوب کو جامد و باطل عقائد سے جس طرح پاک و صاف کیا ہے وہ اسی مردِ دانا و بینا کا کام تھا۔ یہ اُسی کا فیض ہے کہ اب ہم سچائی کے جس بلند مقام پر کھڑے ہیں اسے دنیا کی کوئی طاقت ہم سے چھین نہیں سکتی۔ ہمیں یہ نوید مل چکی ہے کہ حق و صداقت کا مقصد لے کر اٹھنے والوں کے ساتھ خدا کی تائید و نصرت برحق ہے اور خدا انہی کے ساتھ ہوتا ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں۔ آج سے دس سال قبل جشنِ نزولِ قرآن و تکمیل

درسِ قرآن کے حاصلِ حیات موقع پر اس مفکرِ قرآن نے قرآن فہمی کے تعلق سے جن الفاظ میں ہماری رہنمائی کی تھی انہیں پھر دہراتی ہوں۔ باباجی نے کہا تھا قرآن فہمی کے سلسلے میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جو "پل صراط" کے عوامی تصور کے مطابق، بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہوتا ہے کہ وہاں سے اگر پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے گڑھوں میں جا گرے۔ وہ نازک ترین مرحلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خاص نظریہ یا تصور کو ذہن میں لے کر قرآن کی طرف اس لئے آتا ہے کہ اسے اس سے اپنے نظریہ یا تصور کی تائید مل جائے تو اسے قرآن کی بارگاہ سے ایسی پھٹکار پڑتی ہے جو اس کے لئے ہر دو جہاں میں وجۂ روسیاہی ہوتی ہے۔ قرآن کو اپنے خیالات کے تابع رکھنا شرکِ عظیم ہے۔ یہ اپنا دروازہ اس کے لئے کھولتا ہے جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ خالی الذہن ہو کر اس کے آستانِ عالیہ پر دستک دے۔"
ہم میں سے جس نے یہ مثبت اندازِ فکر اختیار کیا اس نے اس آیتِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھا۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کا فضل و کرم ہے کہ ایسا عدیم النظیر ضابطۂ زندگی تمہیں مل گیا ہے۔ لہٰذا: فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح بلے مزد و معاوضہ مل جانے پر جشنِ مسرت مناؤ کہ: هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ انسان جو کچھ بھی جمع کرے یہ متاع اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

میرے عزیز بہن بھائیو! آپ جانتے ہیں کہ ہمارا آج کا یہ اجتماع اسی جشنِ مسرت منانے کے لئے ہے جس کو منانے کی خود ذاتِ باری تعالیٰ نے تاکید کی ہے۔ ہمیں اس حیاتِ دنیوی میں وہ خوشی حاصل ہو رہی ہے جو حیاتِ آخروی کے حصول کی ضامن بنتی ہے۔ قرآنی جوبلی مناتے ہوئے مسرت و شادمانی کی ان ساعتوں میں قرآن ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ حقائقِ قرآنی کے جن گنج ہائے گراں مایہ سے مردِ راہ داں جناب پرویز نے ہمارے دامن بھر دیئے ہیں انہیں ہم افرادِ معاشرہ میں تقسیم کرتے چلے جائیں اور اس کبھی نہ ختم ہونے والی دولتِ قرآن میں دوسرے انسانوں کو شریک کرلیں۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور بڑا صبر آزما مرحلہ جو حوصلہ و استقلال کے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔ مگر ہماری ہمتیں شکستہ اور ہمارے قلوب مایوس کیوں ہوں جبکہ ہمیں اس رفیق و معاون کی ہمراہی حاصل ہے جو پچھلے پچاس سال سے اس میدانِ حق میں مینارۂ نور کی طرح ایستادہ منزل کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس نے ہمیں قرآن کی تعلیم سے اس لئے روشناس نہیں کرایا کہ ہم اسے محض اپنے نہاں خانۂ ذہن میں محفوظ کرلیں۔ بلکہ یہ سمجھایا ہے کہ اس کا صحیح مقام قلبِ انسان کی گہرائیاں ہیں۔ کیونکہ ذہنی سطح پر تیرنے والی تعلیم ایک طرح کا فکری نشاط تو پیدا کر سکتی ہے انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو۔ جب تک اس کی اقدار کے پیمانے نہ بدلیں اس کی سیرت و کردار میں حسن و توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ ترجمان القرآن اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور جب اس طرح قلب و نگاہ مسلمان ہو جائے تو پھر قرآن کے الفاظ میں یہ زمین بدل جاتی ہے یہ آسمان بدل جاتا ہے :؎

گر زمینی آسماں سازد ترا آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

حاضرینِ مکرّم! اس محفلِ جانفزا میں ایک اہم بات کا تذکرہ آخر میں کرتی ہوں کہ اس کا تعلق اپنی جنس یعنی عورت ذات سے ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو، آج سے تیرہ سال قبل جولائی ۱۹۶۵ء میں ہم نے پہلا جشنِ قرآنی منایا تھا۔ اس میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے میں نے عورتوں کی اس محکومیت کا ذکر کیا تھا جو قرآن کی مشعل ہاتھ میں رکھتے ہوئے بھی صدیوں سے ہمارے مردوں نے ہم پر مسلط کر رکھی تھی۔ باباجی کے درسِ قرآن کی روشنی میں آنے سے بہت پہلے کم عمری کے زمانۂ جاہلیت میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر جہانوں کا مالک انصاف پسند خدا اپنے بندوں کے درمیان ایسی تفریق کیونکر روا رکھ سکتا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ کے خود ساختہ مفہوم نے اس مسئلہ کو مزید الجھا دیا تھا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا مگر ہمیں اپنا چارہ ساز مل گیا اور اندھیرا اجالے میں بدل گیا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں پرویز صاحب کی نگہِ حقیقت شناس نے قرآن عزیز کی روشنی میں عورت کا وہ مقام پہنچایا جو فرمانِ ربّی سے اُسے عطا ہوا ہے۔ انہوں نے قرآنِ حکیم کے دیگر الفاظ و آیات کی طرح مذکورہ اہم آیت کے بھی عربی زبان کی رُو سے صحیح معنی اخذ کر کے حق و باطل کو نکھار کر علیحدہ علیحدہ کر دیا اور چمکتے سورج کی طرح یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ خدا کے نزدیک جنسی تفریق نہ وجۂ ذلّت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ نہ مرد محض مرد ہونے کی حیثیت سے عورتوں سے افضل ہیں اور نہ عورتیں محض عورت ہونے کے سبب مردوں سے کہتر۔ زندگی کی ابتدا نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے۔ جس میں لڑکی اور لڑکا دونوں شامل ہیں۔ دونوں نوعِ انسان کے افراد ہیں اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مردوں کو خدا نے عورتوں کا حاکم نہیں بنایا بلکہ خاندان کی روزی مہیا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ہمارے باباجی نے اپنے سلیم بیٹوں کے ساتھ ساتھ اپنی طاہرہ بیٹیوں کو جو محبت و شفقت دی ہے اور ان کے مسائل کو بصیرتِ قرآنی کے ذریعے جس طرح حل کیا ہے اس نے ان کو معاشرے میں خود اعتمادی اور وقار کے ساتھ جینا سکھا دیا ہے۔ دیکھئے دس سال پہلے دسویں جماعت کی ایک طالبہ تبسم ضیاء نے اس کا اعتراف کن الفاظ میں کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ مجھے درسِ قرآن سے کیا ملا تو میں اتنا ہی کہہ سکوں گی کہ مجھے یہاں سے ایک نیا بابا آدم مل گیا جس کی اولاد میں مرد اور عورت یکساں عزت اور تعظیم کے مستحق ہیں۔ جو دنیا میں اس لئے آیا ہے کہ جن بچیوں کو انسانوں کی جہالت اور حقارت نے زندہ قبروں میں دبا دیا تھا انہیں قرآن کی روشنی میں ان قبروں سے نکال کر زندہ انسانوں کی صف میں کھڑا کر دے۔ اس کے بعد میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں کوئی خوف کیوں ہو اور کسی حزن کا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ قرآنی کے جشنِ جوبلی کی تقریب پر

استقبالیہ

میرے واجب الاحترام رفیقو! بھائیو اور بہنو! السلام علیکم!

زندگی بے مقصد ہو تو، میر درد نے اس کا صحیح نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے

لیکن جب زندگی میں کوئی بلند مقصد ہو، تو پھر ہر صبح، صبحِ عید۔ اور ہر شب، شبِ بارات ہوتی ہے۔ اور انہی صبحوں اور شاموں میں بعض صبحیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے باعثِ نمود کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ:

ہو رہی ہے تیری جبیں سے طلوع صبحِ رنگیں کہ جس کی شام نہیں

آج کی صبح ہمارے لئے ایسی ہی صبح ہے جس کی دلکش رنگینیوں سے بزمِ ہستی کی ہر شے ہماری نگاہوں میں حسین نظر آتی ہے۔ جس نیّرِ درخشاں کی فکر کی تابانیوں نے ہماری زندگی کی صبحوں کو اس قسم کی دل آویز رنگینیاں عطا کر دی ہیں، خالقِ افلاک اُسے ابدالآباد تک پائندہ و تابندہ رکھے۔

عزیزانِ من! گذشتہ جولائی، جب مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام میں ضمناً اس کا تذکرہ کیا کہ انہیں قرآن مجید پر غور و فکر اور اس کے پیغام کی نشر و اشاعت میں پچاس سال کا عرصہ صرف ہو گیا ہے، تو ہم وابستگانِ فکرِ قرآنی کے دلوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور اس خواہش نے ہمارے سینے میں انگڑائی لی کہ اس گولڈن جوبلی کی ایسی یادگار منانی چاہیئے جو ہر لحاظ سے اس کے شایانِ شان ہو۔ لیکن اس کے لئے پرویز صاحب کی رضامندی کی ضرورت تھی کیونکہ ان کی منکسر المزاجی کسی قسم کی نمود و نمائش کی اجازت نہیں دیا کرتی۔ چنانچہ وہ بصد مشکل اس پر رضامند تو ہوئے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس تقریب کو نہایت سادہ طریق سے منایا جائے۔ یہ پابندی ہمارے لئے بڑی صبر طلب تھی کیونکہ ہمارے جذبات کی تلاطم خیزیوں کا تقاضا کچھ اور تھا۔ لیکن ہم جانتے تھے کہ اسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ سو آج کا یہ اجتماع اسی رشتہ بپا خواہش کی تکمیل کا مظہر ہے۔

میں اپنی طرف سے، اپنے رفقاء کی طرف سے، اور ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے، آپ احباب کا بسرو چشم استقبال کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جنہوں نے اس میں شرکت فرما کر ہماری مسرتوں میں اضافہ فرمایا۔

عزیزانِ من! پرویز صاحب نے اپنی اس پچاس سالہ فکری زندگی میں قرآنِ خالص پر غور و تدبر اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے اس کی تفصیل تو وہ (اُمید ہے) اپنے خطاب میں خود بیان کریں گے۔ میں اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ جہاں تک میرے جیسے محدود علم رکھنے والے کی نگاہ یاوری کرتی ہے، ہماری ساری تاریخ میں قرآنِ خالص پر اتنا کام کسی اور فرد نے تو کجا' کسی جماعت یا تنظیم تک نے نہیں کیا۔ یہ سعادت اسی مردِ مجاہد کے حصے میں آئی ہے جس کا نام تو پرویز ہے لیکن جو درحقیقت ہے فرہاد! ۔ اِن کی اس خارہ شگافی نے کام کیا کیا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلے خود اپنا ماجرا سناتا ہوں۔ آپ میں سے جن حضرات نے تقسیمِ ہند کا زمانہ دیکھا ہے انہیں یاد ہوگا کہ دہلی سے ایک رسالہ شائع ہوتا تھا۔ مولوی۔ خود رسالہ کا نام بتا رہا ہے کہ وہ کس ذہنیت کا ترجمان ہوگا۔ اس رسالہ کے مالک اور مدیر مولوی عبدالحمید (مرحوم) اس خاکسار کے حقیقی تایا تھے۔ یہ تھا وہ خاندان جس میں میری پرورش ہوئی۔ لیکن میری، یا اُس خاندان کی بدقسمتی۔ کہ میں ان عقائد اور خیالات کے ماحول میں کسی صورت فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔ اِن بزرگوں کی مجھے (بزعمِ خویش) دینداری کے فولادی شکنجوں میں کسنے کی مقدس جدوجہد، اور میری طبیعت کی اس سے بغاوت۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نام کی تہمت کے سوا مجھ میں اسلام کا کچھ بھی باقی نہ رہا۔ ایک عرصہ اسی کشمکش میں گذر گیا۔ نہ نام بدلنے کی ہمت، نہ مروّجہ اسلام میں کوئی جاذبیت۔ تا آنکہ میرے نصیبے نے یاوری کی اور ۱۹۵۱ء میں کراچی میں پرویز صاحب کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس آواز میں کچھ ایسی دلکشی تھی (جسے پرویز صاحب کے مخالفین ساحری کہا کرتے ہیں) کہ میں لحظہ بہ لحظہ اس سے قریب تر ہوتا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ میں، فکرِ قرآنی کی جوبلی کے اس جشن میں آپ حضرات کو خوش آمدید کہنے کو اپنی زندگی کی انتہائی خوش بختی تصور کرتا ہوں۔

اور یہ تبدیلی تنہا میرے اندر ہی واقعہ نہیں ہوئی۔ اس بیس پچیس سال کے عرصہ میں جب میں اس قرآنی فکر کے سمجھنے اور سمجھانے کی تحریک سے وابستہ رہا، مجھے اس قسم کے سینکڑوں نوجوانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو پہلے میری طرح اسلام کے نام تک سے دل برداشتہ تھے لیکن پرویز صاحب کی پیش کردہ فکر سے متأثر ہو کر قرآن کے والہانہ شیدائی بن گئے۔ جو حضرات طنزیہ انداز سے کہا کرتے ہیں کہ پرویز صاحب کی فکر نے کیا کیا ہے، میں ان سے پوچھا کرتا ہوں کہ کیا اسلام کے نام سے بیزار، ہزاروں، لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے قلب و نگاہ میں اس قسم کی خوش آئند تبدیلی پیدا کر دینا، کچھ کم کام ہے!

مفاد پرست لیڈروں نے ہماری جذباتی قوم کو اس قدر ہنگاموں کا خوگر بنا دیا ہے کہ ان کے ذہن سے

فکر اور سوچ کی اہمیت ہی گم ہو چکی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ فکری تبدیلی کے بغیر قوم کے خارجی احوال میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پرویز صاحب کا بنیادی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قوم کے دل میں فکر کی اہمیت کا احساس بیدار کر دیا ہے۔ فکری تبدیلی کس طرح عملی سیاست کا رُخ بدل دیتی ہے میں اس کی چند ایک مثالیں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

۱- ہمارے یہاں صدیوں سے اسلام کو مذہب سمجھا جاتا تھا۔ مذہب سے مراد ہوتا ہے خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ سا تعلق، جو لفظی عقائد اور رسمی عبادات کے ذریعہ قائم ہو جاتا ہے۔ پرویز صاحب نے یہ آواز بلند کی کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور دین سے مفہوم ہوتا ہے مکمل ضابطۂ حیات، جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوتا ہے، اسے نظامِ مملکت بھی کہا جاتا ہے۔ مذہب پرست طبقے کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ لیکن آج ہر شخص اسلام کو دین کہہ کر پکارتا ہے اور اسلامی نظام قائم کرنے کو اسلام کا مقصد قرار دیتا ہے۔

۲- پرویز صاحب نے کہا کہ اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی روٹی، کپڑا، مکان، صحت، تعلیم وغیرہ کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے اس تصور کی بھی مخالفت ہوئی اور آج اسی طبقہ کی زبان سے ہم سن رہے ہیں کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں آگیا تو وہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے۔

۳- پرویز صاحب نے کہا کہ اسلامی مملکت اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گی جب تک وسائلِ پیداوار اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ اس بنا پر زمین پر ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے خلاف مذہبی پیشوائیت نے دہائی مچا دی کہ پرویز کمیونسٹ ہے۔ اور آج وہی مذہبی پیشوائیت زمین پر ذاتی ملکیت کے رقبوں کو کم از کم حد تک لانے کو عین اسلام قرار دے رہی ہے۔

۴- اسی سلسلہ میں پرویز صاحب نے کہا کہ انڈسٹریز کو بھی مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے۔ اس کے خلاف فتویٰ صادر ہوا کہ قومیانے کا یہ تصور انسانیت کش ہے اور ابلیس کی ایجاد۔ آج اسی طبقہ کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ نئی صنعتوں کو ذاتی ملکیت میں دینا تو ایک طرف جو صنعتیں اس سے پہلے قومی ملکیت میں لی جا چکی ہیں انہیں اس کے سابقہ مالکوں کو واپس کرنا بھی اسلام کے خلاف ہے۔

۵- پرویز صاحب نے کہا کہ مسلمان غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک جماعت ہے جسے اُمت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کے اندر مختلف پارٹیوں کا وجود اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ ملک کی ہر پارٹی کی طرف سے ان کے پیش کردہ اس تصور کی مخالفت ہوئی۔ اور آج کیفیت یہ ہے کہ اسلام کے سب سے بڑے مدعی یہ اعلان کر رہے ہیں مختلف پارٹیوں کا ایک پارٹی میں ضم ہو جانا عین مطابقِ اسلام ہے۔

۶- پرویز صاحب نے کہا کہ دو قومی نظریہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اس نظریہ کا فطری

نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم اقلیتوں کے جداگانہ انتخاب ہونے چاہئیں۔ اسے قومی انتشار کے نام سے تعبیر کیا گیا اور اب اسی جداگانہ انتخاب کو عین مطابقِ اسلام قرار دیا جا رہا ہے۔

۷۔ عورتوں کے متعلق ہمیں بتایا جاتا تھا کہ ان کا مقام گھر کی چار دیواری ہے۔ اسلام انہیں سیاست میں کسی قسم کا حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ پرویز صاحب نے کہا کہ قرآن کریم زندگی کے معاملات میں مردوں اور عورتوں میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ ان کے اس تصور کے خلاف دہائی مچادی گئی لیکن رفتہ رفتہ ان مخالفت کرنے والوں نے انہی کے پیش کردہ تصور کو اپنایا۔ عورتوں کو نہ صرف ووٹ دینے کا حقدار قرار دیا بلکہ ان کے صدرِ مملکت تک کے منصب کے لئے امیدوار ہونے کو بھی عین مطابقِ اسلام قرار دیا۔ اور اب مجالسِ قوانین ساز میں ان کے لئے مخصوص نشستیں ان کا آئینی حق قرار دیا گیا ہے۔

۸۔ پرویز صاحب نے کہا کہ مساجد جیسی وسیع و عریض عمارتوں کو صرف نماز کے لئے مخصوص نہیں رکھنا چاہیئے۔ ان میں بچوں کے لئے مدرسے قائم کر دینے چاہئیں۔ اس کے خلاف شور مچا دیا گیا کہ یہ عبادت گاہوں کی توہین ہے۔ اور اب علمبردارانِ شریعت کی طرف سے یہ سکیمیں بنائی جا رہی ہیں کہ مسجدوں میں بچوں کے لئے مدرسے قائم کرنے چاہئیں۔

۹۔ ملک میں لاؤڈ اسپیکر نئے نئے آئے تو علماء حضرات نے ان کے استعمال کو حرام قرار دیا۔ پرویز صاحب نے کہا کہ یہ ذرائع ابلاغ ہیں۔ فی ذاتہٖ یہ نہ حرام ہیں نہ حلال۔ انہیں صحیح اور جائز مقاصد کے لئے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ان حضرات کی طرف سے اس تصور کی بھی مخالفت ہوئی۔ اب وہی علماء حضرات نمازوں تک میں لاؤڈ اسپیکر اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

۱۰۔ ہماری مذہبی پیشوائیت یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم قرار دیتی تھی۔ پرویز صاحب نے از روئے قرآن ثابت کیا کہ یتیم پوتے دادا کے ترکہ سے محروم نہیں رکھے جا سکتے۔ اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ لیکن بفضلہ الحمد کہ پرویز صاحب کا پیش کردہ قرآنی تصور، عائلی قوانین کا ایک جزو بن گیا۔ اور اس طرح ان مظلوموں کی دادرسی کی سبیل پیدا ہو گئی۔

آخر میں، میں ایک ایسی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جو آپ احباب کے لئے یقیناً وجہِ حیرت ہو گی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے اہم سوال مملکت کے لئے اسلامی قوانین کا مرتب کرنا تھا۔ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ ملک کے اکتیس علماء پر مشتمل ایک مجلس نے قرارداد پاس کی کہ مملکت کے قوانین کتاب و سنت کی بنیاد پر مرتب کئے جائیں۔ پرویز صاحب نے کہا کہ کتاب و سنت کی بنیاد پر پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر قبول کر لیں۔ ایسا ضابطہ صرف قرآن کی بنیادوں پر مرتب ہو سکتا ہے۔ اس پر ملک میں طوفان برپا کر دیا گیا اور دہائی مچادی کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے منکرِ سنت ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ اور اس بناء پر ایک ہزار علماء نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ بیس سال تک یہ طوفان برپا رہا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ وہ بات ہے جس کے متعلق میں نے شروع میں

کہا تھا کہ آپ کو حیرت ہوگی۔ بیس سال کی مخالفت کے بعد خود مودودی صاحب نے اپنی جماعت کے ترجمان ہفت روزہ ایشیا کی ۲۳ اگست ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں یہ اعلان کیا کہ ــــ کتاب و سنت کی بنیادوں پر پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا جو مختلف فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔

سوچئے برادرانِ عزیز کہ یہ بات وجہِ حیرت ہے یا نہیں ــــ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت کی موجب اگلی بات ہے۔ اور وہ یہ کہ اس اعلان کے باوجود مطالبہ یہی کیا جا رہا ہے کہ ملک میں پبلک لاز کتاب و سنت کے مطابق مرتب کئے جائیں۔ یعنی مطالبہ اس بات کا ہے جس کے متعلق خود کہا جا رہا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔

میں نے یہ چند مثالیں یہ بتانے کے لئے پیش کی ہیں کہ پرویز صاحب نے جو قرآنی فکر پیش کی اس نے کس طرح ہمارے ملک کی سیاست کو متاثر کیا ہے۔ پرویز صاحب نے اس تبدیلی کے لئے نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کیا، نہ نعرہ بلند کیا، نہ کوئی پتھر پھینکا نہ شیشے توڑے۔ نہ اپنی کوئی پارٹی بنائی، نہ عملی سیاست میں حصہ لیا۔ اس کے بعد آپ فیصلہ فرمایئے عزیزانِ من کہ پرویز صاحب کی فکری تحریک نے کیا کام کیا ہے۔ اور یہ... تو ابھی زمانہ حال کی بات ہے اور وہ بھی ایسے حالات میں جب مذہبی طبقے کی طرف سے ان کی اس قدر مخالفت ہو رہی ہے، آنے والے زمانے میں جب مخالفتوں کے بادل چھٹ جائیں گے اور پرویز صاحب کی پیش کردہ قرآنی فکر اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ ضوفشاں ہوگی اس وقت دیکھنے والے دیکھیں گے کہ قرآنی روشنی سے کس طرح یہ زمین جگمگا اٹھتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے متعلق کہا تھا کہ وہ "شاعرِ فردا" ہیں ہم پرویز صاحب کے متعلق حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ "مفکرِ فردا" ہیں۔ اس قسم کے لوگ درحقیقت اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ ان کے جسد میں زمانے کی امامت آتی ہے۔

پرویز صاحب کی فکر کے اثر انداز ہونے میں، جہاں ان کے اُن محکم دلائل کا گہرا تعلق ہے جو قلب و دماغ کا کامل سکون اور اطمینان عطا کر دیتے ہیں اس کے ساتھ ان کے اسلوبِ بیان کا بھی کچھ کم حصہ نہیں۔ اردو ادب میں انہیں صاحبِ اسلوب قرار دیا جاتا ہے۔ میں نے کئی طالب علموں کو دیکھا ہے کہ وہ محض زبان کی خاطر پرویز صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اگرچہ بعد میں ہوا یہ کہ وہ ان کی فکر کے گرویدہ ہو گئے۔ ان کے اسلوبِ بیان کی یہ نادرہ کاری ان کی ہر تصنیف... میں پائی جاتی ہے۔ میں اس وقت مثال کے طور پر ان کی تحریروں کے دو ایک اقتباسات پیشِ خدمت کروں گا۔ اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں انہوں نے پہلے یہ بتایا ہے کہ انسان کو جو خصوصیت حیوانات سے متمیز کرتی ہے وہ اس کے اختیار و ارادہ کی صلاحیت ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

اختیار و ارادہ کی یہ وہ خصوصیت ہے جس سے نبضِ کائنات میں نمود اور زندگی کی

جوئے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار و ارادہ کے بغیر یہ دنیا پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ اور درندوں، چرندوں، پرندوں کا بے کیف مسکن تو ہوتی حسن کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتشِ سوزندہ اس کے نصیب میں نہ ہوتی۔ یہ سب اختیار و ارادہ کی سحرکاریاں ہیں جن سے یہ ویرانہ، رنگ و تعطر کا کاشانہ بن گیا۔ (ص ۱۷)

اس کے بعد وہ مسئلہ خیر و شر کی طرف آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آدمؑ کے ساتھ ابلیس کی تخلیق ضروری تھی کیونکہ انسانی خودی کی نمود اور نشوونما اپنے سے غیر کے ساتھ ٹکرانے سے ہوتی ہے ـــــ وہ لکھتے ہیں :-

قانونِ ارتقاء کی رو سے استحکام و عروج اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ متصادم و متحارب قوتوں سے نبرد آزما ہوا جائے۔ جن انواع کو نامساعد احوال و ظروف سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا وہ آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ لیکن اگر اس کی راہ میں پتھروں کی (FALLS) نہ آئیں تو اس کی پُرسکوت روانی آہستہ آہستہ مبدّل بہ سکون ہو جائے اور یہ جوئے رواں جمود و تعطل کا جوہڑ یا تالاب بن کر رہ جائے۔ بربط کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بلا مضراب کبھی بیدار نہیں ہو سکتے۔ آئینۂ شمشیر میں کبھی آب و تاب پیدا نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اسے سنگِ فساں پر صیقل نہ کیا جائے۔ چقماق کی شعلہ فشانی پتھر کی رگڑ کے بغیر ممکن نہیں۔ شیشہ میں کبھی جوہرِ آئینہ پیدا نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کے پیچھے زنگار کی کثافت نہ ہو۔ اسی طرح خودی بھی اپنی نمود، استحکام اور عروج کے لئے اپنے سے غیر کو چاہتی ہے۔ اگر خودی اپنے غیر سے متقابل و متصادم نہ ہو تو ہنگامۂ کائنات سرد پڑ جائے۔ بزمِ ہستی کی رنگینیاں بے کیف ہو جائیں۔ یہ جہانِ رنگ و بو بجھ سے مٹی کا گھروندہ بن کر رہ جائے۔ خونِ رنگِ کائنات کی تپش خودی کے ولولۂ نمود کی مظہر اور اس کی لذّتِ کشمکش کی رہینِ منّت ہے۔ (ص ۴۷)

داستانِ حضرت یوسفؑ کے ضمن میں خوابوں کے متعلق دورِ حاضرہ کے علم تجزیۂ نفس کی تحقیقات پر بحث کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ انسانی زندگی کے وہ واقعات اور حوادث جنہیں انسانی شعور فراموش کر دیتا ہے، اس کا نفسِ غیر شعوریہ انہیں اپنے اسٹور روم میں محفوظ رکھ لیتا ہے۔ ان تاثرات میں جنہیں غیر شعوریہ یوں محفوظ کر لیتا ہے

ہزاروں خوں گشتہ آرزوئیں۔ سینکڑوں پامال شدہ تمنائیں، بیسیوں ایسی للچائی ہوئی نگاہیں جو حسرت بن کر دل کی گہرائیوں میں جا چھپی ہوں، خوابیدہ ہوتی ہیں۔ جب نفسِ شعوریہ کی دنیا سوتی ہے تو یہ خوابیدہ حسرتیں جاگ اٹھتی ہیں لیکن بے ربطی مضمون سے طلسم ہوشربا کا افسانہ بن کر سامنے آتی ہیں۔ اور جب نفسِ شعوریہ کی آنکھ کھلتی ہے تو اس افسانے کے بعض ٹکڑے کسی بھولے ہوئے واقعہ کی دھندلی سی یادیں تازہ کرا دیتے ہیں جیسے مرمریں گرد میں

ڈوبی ہوئی وادیٔ کہسار کے اس پار، رات کے سناٹے میں دور بنسری کی آواز دل کے نرم و نازک گوشوں میں میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیتی ہے۔ (جوئے نور ص۲۷)

کہیے عزیزانِ من مذہب کی دنیا میں اس انداز کا اسلوبِ بیان کہیں اور بھی دیکھنے میں آتا ہے؟ دایۂ فطرت نے علامہ اقبالؒ کو اس خصوصیت سے نوازا تھا کہ انہوں نے قرآنی حقائق کو شعر کی دلآویزی کے آئینے میں اس طرح پیش کیا کہ جس نے سنا جھوم جھوم اٹھا۔ مبدأ فیض نے اسی انداز کی صلاحیت پرویز صاحب کو عطا کی ہے۔ اقبالؒ قرآنی حقائق کو زبانِ شعر میں بیان کرتا تھا۔ پرویز نثر میں شاعری کرتا ہے۔ اقبالؒ کی طرح پرویز کو بھی ذاتِ رسالتمآبؐ سے عشق ہے اور عشق بھی بے پایاں۔ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کے سامنے کسی نے نبی اکرمؐ کا نام لیا ہو اور ان کی آنکھ کے آبگینے سے احترام و محبت کے آنسو نہ چھلک پڑے ہوں۔ پرویز صاحب کی تصنیف "معراجِ انسانیت" سیرتِ نبی اکرمؐ پر ایسی مایۂ ناز کتاب ہے جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ اپنی اس کتاب میں جب وہ حضور رسالتمآبؐ کی اس دنیا میں تشریف آوری کے مقام پر پہنچتے ہیں تو وجد و کیف کے عالم میں اس طرح رقص کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ زمین رقص کرتی نظر آتی ہے۔ آسمان رقص کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس صبحِ بہار کے دو ایک مناظر آپ بھی دیکھئے اور جھوم جھوم جائیے۔ لکھتے ہیں:-

۔۔۔ جب مشیّتِ ایزدی کی تدبیرِ محکم جس کے لئے زمین و آسمان قرنہا قرن سے سرگرداں پھر رہے تھے اپنی پختگی تک پہنچی۔ جب انسانیت جس کے لئے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے گہوارۂ طفولیت سے حریمِ شباب میں آگئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آگیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے اندر رازہائے درونِ پردہ کے معدنِ لعل و گہر کو سمولے تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کریں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آگئی۔ ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے، چاند مسکرایا۔ ستارے ہنسے، آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصور بن کر جھکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لئے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی زمین سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے۔ بلدِ امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی جس کی طرف جبلِ تین پر حضرت نوحؑ نے اشارہ کیا تھا اور جسے کوہِ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجۂ تسکینِ خاطر بنایا تھا۔ جس کی آمد آمد کی بشارتیں وادیٔ طورِ سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لئے دشتِ عرب میں حضرت خلیل اکبرؑ اور ذبیحِ اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا کہ جس کے انتظار میں زمانہ نے لاکھوں

کروڑیں بدلی تھیں، آیا اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاءِ اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اُٹھے ــــ فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوسِ گوش صداؤں سے گونج اٹھی اور انس و جان، وجد و کیف کے عالم میں پکار اُٹھے کہ ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا (ص ۷۳)

سوچئے، برادرانِ عزیز! کہ نعت کی دنیا میں اس سے بہتر انداز کہیں اور بھی نظر آتا ہے؟ الفاظ ہیں کہ ہیرے کی طرح ترشے ہوئے، اور چشموں کی طرح ابلتے ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود نہ کہیں حفظِ مراتب کو ہاتھ سے جانے دیا ہے نہ ہی جذباتی غلو میں حدود فراموش ہوئے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ دین ایک ہی تھا جو شروع سے آخر تک انبیاء کرامؑ کو دیا جاتا رہا۔ حضورؐ سے پہلے یہ جزءً جزءً ملتا رہا اور حضورؐ کی وساطت سے وہ مکمل شکل میں دنیا کے سامنے آگیا۔ دیکھئے، اس حقیقت کو پرویز صاحب کس انداز سے بیان کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

یہ پیغام (جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملا) نہ کوئی انوکھا پیغام تھا اور نہ یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمدؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدیؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منّت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزماںؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ اُن ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارض و سما کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحتِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذرّاتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی کہ جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے اور یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے یہ ملّت تھی۔ وہ نقطے تھے یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی یہ انتہا تھا۔ (ص ۷۴)

یہ ہے پرویز کا عشقِ ذاتِ رسالتمآبؐ کے ساتھ۔ اور یہ ہے ان کا اندازِ بیان۔ اور اس پر ویز کو برادرانِ عزیز!

یہ حضرات مفکرِ شانِ رسالت قرار دیتے ہیں۔ اس پر ہم کیا کہہ سکتے ہیں! یہ ہے پرویز صاحب کا وہ اسلوبِ بیان ارباب ادب بھی جس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

میں نے برادرانِ عزیز! آپ کے سامنے پرویز صاحب کا نام کتنی بار لیا ہے لیکن اس سے ہر بار غیر شعوری طور پر میرے دل میں وہ کھٹک پیدا ہوئی ہے جو کسی بزرگ خاندان کا خالی نام لینے سے اس احساس سے پیدا ہوتی ہے کہ اس میں سوءِ ادبی پائی جاتی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے! اس باب میں بھی ہمارے اس بزرگِ خاندان کا طبعی انکسار ہمارے راستے میں حائل ہو جاتا ہے۔ کسی زمانے میں وہ اپنے خاندانی عرف، چودھری صاحب کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ انہوں نے اسے ترک کر دیا کہ اس میں انہیں (بقول ان کے) ان کے عہدِ جاہلیت کی بو آتی تھی۔ ہم نے انہیں علامہ صاحب کہہ کر پکارنا چاہا تو وہ پھر گلوگیر ہو گئے کہ ان کے نزدیک علامہ، پی ایچ ڈی کے ڈگری یافتہ کو کہا جاتا ہے۔ مولانا اور مرشد کہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک۔ مولا اور مرشد' خدا ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے ہمارے لئے بڑی مشکل پیدا ہو گئی۔ ان کی بچیاں انہیں باباجی کہہ کر پکارتی تھیں۔ اس میں احترام اور محبت دونوں کی جھلک موجود ہے۔ ہم نے بھی ان کے تتبع میں انہیں باباجی کہہ کر پکارنا شروع کر دیا کہ بالآخر یہ ہمارے اس وسیع قرآنی خاندان کے بھی بزرگ ہیں۔ اگرچہ وہ اس سے بھی کچھ خوش نہیں۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ تم لوگوں نے باباجی کہہ کہہ کر مجھے خواہ مخواہ بوڑھا بنا دیا، حالانکہ میں نہ بوڑھا ہوں' نہ بوڑھا ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد وہ اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں کہا کرتے ہیں کہ اس سے کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے مرنے کے بعد باباجی کے مزار پر عرس ہونے لگ جائیں اور لوگ مرادیں مانگنے آجایا کریں۔ بہت سے مزار اسی طرح اولیاء اللہ کے آستانے بن جایا کرتے ہیں ——— اور باباجی کی ان باتوں کے تذکرہ نے میری نگاہ کا رُخ ایک اور طرف پھیر دیا۔ جن حضرات سے پرویز صاحب کا تعارف ان کی کتابوں کے ذریعے ہوا ہے ان کے نزدیک وہ بے شک ایک بہت بڑے عالم، اور عظیم مفکر ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ حقیقی پرویز کتابوں کے اوراق میں سامنے نہیں آتا۔ اس کی جھلک ان کی نجی محفلوں ہی میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہاں اِن کے علم کی وسعت، فکر کی گہرائی، نگاہ کی بلندی کے ساتھ ان کے احساساتِ لطیفہ کی نُزہت و نزاکت، مذاقِ سلیم کی ملاحت، اور جذباتِ سوز و گداز کی رِقّت بلا حجاب و بلا نقاب وجہ فروغِ دیدہ اور باعثِ نشاطِ روح ہوتی ہے۔ وہاں نظر آتا ہے کہ ان کی شخصیت کن کن نوادرات کا مجموعہ ہے اور مبداءِ فیض نے انہیں قلب اور دماغ کی کیسی کیسی متنوع صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ کوئی موضوع ہو، اس پر بات تو قرآنِ عظیم سے چلے گی لیکن اس سے مربوط، حکمائے یونان سے لے کر عہدِ حاضر تک کے مفکرین، مؤرخین، ماہرین علم الانسان اور علم اللسان، سائنسدان، سائیکالوجسٹ، اربابِ مذہب، اعیانِ تصوّف۔ غرضیکہ ہر علم اور ہر فن کے اربابِ فکر و نظر کی آرا اور افکار اس روانی کے ساتھ پیش کرتے چلے جائیں گے گویا ایک انسائیکلو پیڈیا ان کے سامنے کھلا رکھا ہے۔ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ فطرت نے اس پیکر میں کس کس قسم کی صلاحیتیں سمو دی ہیں اور عمر کے اس حصے میں بھی کس بلا کا حافظہ مرحمت کیا ہے۔ پھر لُطف یہ کہ خشک سے خشک موضوع میں بھی اپنے سامعین کو کبھی (BORE) نہیں ہونے دیتے

ویسے تو ان کا عام انداز بھی بڑا ادیبانہ ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ حسب موقعہ نہایت برجستہ لطافت اور شائستہ مزاح، فضا میں شگفتگی پیدا کئے چلے جاتے ہیں اور کیا مجال کہ لطافت اور مزاح میں دامنِ ثقاہت ذرا بھی ہاتھ سے چھوٹنے پائے۔ شعر کی دنیا کی طرف آئیے تو اقبالؒ ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس کے علاوہ، قدیم و جدید فارسی اور اُردو، حتیٰ کہ پنجابی تک کے شعراء کے کلام، اور کلام بھی ایسا منتخب کہ خود شاعر کو بھی اس پر وجد آجائے۔ شاعری سے آگے بڑھ کر موسیقی اور مصوّری کی طرف آئیے تو ان میں درک کا یہ عالم کہ میں نے اچھے اچھے استادانِ فن کو یہ کہتے سنا ہے کہ ان جیسا جوہر شناس کم دیکھنے میں آئے گا۔ جن موضوعات پر یہ اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں ان کا دائرہ علوم و فنون تک ہی محدود نہیں، زندگی کے روزمرّہ کے معاملات کے متعلق بھی جو سوال سامنے آجائے اس میں ان کی معلومات کا یہی عالم ہوتا ہے۔ ہم لوگ اپنی نجی زندگی تک کے معاملات کے لئے ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو نہایت حسن و خوبی سے حل کر دیتے ہیں۔ ان کا مشورہ ایسا صائب اور ان کی رائے اس قدر رفیع ہوتی ہے کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ انہیں اس قسم کے معاملات کا تجربہ کیسے حاصل ہوا۔ اس منبعِ علم و فراست کی جامع شخصیت کی یہ جھلکیاں ان کی نجی محفلوں ہی میں سامنے آتی ہیں۔ اور کس قدر خوش بخت ہیں وہ اربابِ ذوق جنہیں ان جھلکیوں سے بہرہ یاب ہونے کی مسّرت نصیب ہوتی ہے۔

سب سے بڑی بات یہ کہ علم و فکر کی ان بلندیوں کے باوجود، کیا مجال جو ہمیں کبھی محسوس بھی ہونے دیں کہ وہ ہم میں کوئی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کی رو سے ہمارے نزدیک ان کا مقام صرف ایک استاد کا ہے اور تعلقات کی دنیا میں ایک دوست کا۔ اس سے بڑھ کر ہم نے کبھی اپنے کسی جذبہ کا اظہار کیا ہے، یا بے ساختہ اس کا اظہار ہوگیا ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر فوراً روک اور ٹوک دیا ہے کہ تم لوگ بھی ہو اسی شخصیت پرستی کی طرح ڈالنے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جسے اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ نے، کہ آسمان کی آنکھ نے جس سے بلند مرتبہ شخصیت نہیں دیکھی، اپنی عدیم النظیر سیرت کی مثالوں سے اس طرح مٹا کر رکھ دیا تھا کہ پیار اور محبت کے جذبہ سے سرشار بیٹی کی آمد پر خود تو اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن اپنی تعظیم کے لئے صحابہؓ کو بھی کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ گھر کی زندگی کو خوشگوار رکھنے کا طریق یہ ہے کہ تم گھر میں بچوں کی طرح رہو اور بڑے اس وقت بنو جب بچوں کی کسی ضرورت کو پورا کرنا ہو۔ باباجی کی بچیاں، بالخصوص نجمہ اور سلمیٰ جو ہمارے لئے بمنزلہ اپنی بیٹیوں کے ہیں اور جنہیں آپ نے طلوعِ اسلام کی کنونشنوں میں قرآنی فکر کے چراغ روشن کرتے دیکھا ہوگا، کہا کرتی ہیں کہ ہمارے باباجی کی زندگی حضرت عمرؓ کے اس قول کی عملی تفسیر ہے۔ بچوں کے ساتھ ان کی محبت کی یہ کیفیت ہے کہ جب وہ اپنے قرآنی کام میں جذب ہوتے ہیں تو کوئی چیز ان کے انہماک میں مخل نہیں ہوسکتی۔ لیکن جونہی کسی بچے کے رونے کی آواز ان کے کان میں پڑی وہ تڑپ اٹھتے ہیں اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ، لپک کر اندر آجاتے ہیں۔ ان بچوں کی بھی یہ کیفیت ہے کہ جب کوئی بچہ روئے چلا جائے اور ہماری ہزار جتن کے باوجود چپ نہ کرے تو ہم اسے باباجی کی گود میں ڈال دیتی ہیں اور جونہی وہ اسے اٹھاتے ہیں وہ نہ صرف

چپ ہو جاتا ہے بلکہ ہنسنے لگ جاتا ہے (وہ کہتی ہیں کہ) ہمارے گھر میں یہ مشہور ہے کہ باباجی بچوں کو ضرور کوئی وظیفہ چڑھ کر دم کرتے ہیں لیکن باباجی کہا کرتے ہیں کہ میری بچیو! خلوص پر مبنی پیار سے زیادہ مؤثر کوئی وظیفہ نہیں۔

جہاں تک ان کے حسنِ کردار کا تعلق ہے، میں اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ ہم نے اپنے پچیس تیس سالہ تعلقات میں، انہیں ہمیشہ معاملہ کا کھرا۔ بات کا سچا اور وعدہ کا پکا پایا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مخالفین نے ان کے خلاف ہزار قسم کے الزامات تراشے لیکن ان کے کیریکٹر کے خلاف ایک لفظ تک کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ کردار کی پختگی کے لئے انسان کو مستقل اقدار کی حدود کا پابند رہنا پڑتا ہے۔ اقدار کی پابندی تو ایک طرف پرویز صاحب نے اپنی روزمرہ کی زندگی کو بھی ایسا نظم و ضبط کے تابع رکھا ہے کہ وہ کہا کرتے ہیں کہ میں نے خانقاہیت کے لبادے کو تو دور پھینک دیا، لیکن گلیمِ درویشی کو اپنے سینے کے ساتھ لگائے رکھا ہے اور میرا استغنا اسی کا رہینِ منت ہے۔

میں نے عزیزانِ من! پرویز صاحب کی قرآنی فکر کے تذکرہ کے ساتھ ان کی ذاتی۔ نجی اور درونِ خانہ تک کی زندگی کی بھی کچھ جھلکیاں پیش کی ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ آج کل دنیا میں عام طور پر مشاہیر کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں فرق کیا جاتا ہے لیکن قرآنِ مجید ان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ یہی انداز قرآنی تعلیم کو پیش کرنے والے کی زندگی کا ہونا چاہیئے۔ جہاں تک میری نگاہ میری یادری کرتی ہے پرویز صاحب کی زندگی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔ ان کے رفقاء جو اس تقریب میں شمولیت کے لئے دور دور سے تشریف لائے ہیں وہ گذشتہ بیس پچیس سال سے ان کے شریکِ سفر ہیں اگر ان کی زندگی ایسی آئینہ دار نہ ہوتی تو یقین مانئے ہم میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہ ہوتا۔ قرآن نے ہمیں ایسی ہی تعلیم دی ہے۔

پرویز صاحب کے پیغام کی جو مخالفت ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اس ضمن میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ جب اور جہاں بھی قرآنِ خالص کی آواز بلند ہوئی، قدامت پرست طبقہ نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔ نقصان تو اس سے ہمیشہ اور ہر جگہ پہنچا لیکن اس سے جس قدر نقصان پاکستان کو پہنچا ہے اس کے احساس سے دل لرز جاتا ہے۔ اس خطۂ زمین کو حاصل ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ یہاں قرآنی نظام قائم ہو۔ اگر یہ حضرات پرویز صاحب کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے راستے میں روک بن کر کھڑے نہ ہو جاتے تو یہاں قرآنی نظام قائم ہو جاتا اور اس سے پاکستان ہی کا نہیں کرۂ ارض کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ ان لوگوں کی اس مخالفت سے عالمِ انسانیت کو جو نقصان پہنچا اس کی تلافی تو ہو جائے گی کہ انسانیت زمان اور مکان کی حدود میں محصور نہیں۔ وہ آج نہیں تو کل قرآنی برکات سے مستفیض ہو جائیگی لیکن اس سے جو نقصان پاکستان کو پہنچا ہے اس کی تلافی کی بحالاتِ موجودہ کوئی صورت نظر نہیں آتی اور یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے۔

آخر میں میں آپ احباب کو ایک بار پھر خوش آمدید کہتا ہوا آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس تقریب میں شرکت فرما کر ہماری مسرتوں میں اضافہ فرمایا۔

والسلام

محمد اسلام

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کراچی

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ایک نئے انداز کا سپاسنامہ

(بشرفِ نظر، استاذِ محترم جنابِ پرویز)

حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ جب خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے تھے تو یہ بات واضح کر دیتے تھے کہ یہ تمام تر لوگوں کی بھلائی کے لئے ہے اور اس میں ان حضرات کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہیں۔ خود بہ زبانِ وحی اُن سے کہلوایا گیا۔

وَمَآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (۲۶/۱۲۷)

میں اس بات کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ تو پروردگارِ عالم پر ہے (اور بس!)

خدا کا پیغام پہنچانے والوں کا ہر دور میں یہی طریق رہا ہے اور دان، انبیائے کرامؑ کے ماننے والوں پر بھی سنتِ رسلؑ کا اتباع لازم ہے۔

محترم پرویز صاحب، پچھلے پچاس سال سے، خدا کے اس آخری پیغام کو جو خدا نے اپنے آخری نبیؐ کی معرفت دنیا کو دیا اور جسے قیامت تک کے لئے ساری انسانیت کے لئے ضابطۂ ہدایت بننا ہے عام کر رہے ہیں اور اس تمام عرصہ میں اس طرح کہ:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

بلکہ اس عرصہ کا بیشتر حصّہ تو سرکاری ملازمت کا بندھن بھی زنجیرِ پا تھا، گویا ؎

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقّت بھی اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان کی تجسّس پسند طبیعت نے روایتی باتوں سے مطمئن نہ ہو کر حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی اور خدا کی دی ہوئی روشنی نے ہر چیز اُجاگر کر دی ——— ورنہ جس انداز میں، وہ بتاتے ہیں کہ ان کی تربیت شروع ہوئی تھی شاید وہ عمر بھر تصوّف کی پُر اسرار وادیوں میں گم رہتے۔ اس دنیا میں ان کو تو شاید ایک مقام پھر بھی حاصل ہوتا مگر ہم لوگ تشکیک و ریب کے خارزاروں میں ہی بھٹکتے پھرتے ——— ہم لوگ کہ مسلمانوں کی اولاد کہلاتے ہیں، روحانی ریاضتوں کی مشقتوں سے گزر کر کسی موہوم منزل تک پہنچنے کی تاب و توانائی رکھتے ہیں نہ فرصت و فراغت، رسماً اور اعتقاداً اسلام کو ہر مرض کا علاج، ہر دکھ کا مداوا اور انسانیت کے لئے فلاح کا باعث سمجھتے ہیں مگر جب ہم یہ کہتے ہیں تو ہمارے

دل ہماری زبان کے رفیق نہیں ہوتے۔ ہمارے دلوں میں خود اس بات کا یقین اور ایمان نہیں ہوتا۔ وہ تو خود ہر لحظہ لرزاں و ترساں ہوتے ہیں۔ دماغ میں جو سوال اُٹھتے ہیں ان کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ انہیں مبہم فلسفوں کی تھپکیاں دے کر سلا دیا جاتا ہے۔ قرآن کی زبان سے ہم واقف نہیں اور ترجمے ہمیں کوئی..... راہ نہیں دکھاتے۔ اس لئے ہم، مذہب میں عقل کو کیا دخل کہہ کر، خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہم ——— جو اس کتاب کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں جو بار بار کہتی ہے، تم سوچتے کیوں نہیں، تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے، تم تدبّر کیوں نہیں کرتے ——— جو بتاتی ہے کہ ان باتوں میں اولی الالباب کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اس حالت میں اپنے ذہنی شکوک کا "نتارا" کئے بغیر ہم بس ان پر پردہ ڈال سکتے تھے۔ گویا شرک کی منافقت کی زندگی گزارتے۔

ہماری دنیاوی پس ماندگی نے ہمیں اقوامِ عالم میں ایسا ذلیل و رسوا کر رکھا ہے کہ ہم سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں۔ ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس انسانیت کے دکھوں کا مداوا ہے۔ جب ہم اپنی پسماندگی دور کرنے کے قابل نہیں۔ یہ کہتے ہوئے ہر لحظہ خطرہ ہے کہ سننے والے کہیں گے، تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو! ہمیں مسائل کا حل بتانے سے پہلے اپنے دکھوں کا، اپنے غموں کا تو کچھ تدارک سوچو ——— سوچو، غور و فکر کرو ——— اور یہی ہماری چڑ ہے ——— غور و فکر ——— غور و فکر کو ہم صدیوں سے تج چکے ہیں۔ ہم، جن کے اپنے ہادیؐ و آقا کی زبان سے اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں کہلوایا ——— اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا۔ (۳۴/۴۶)۔

ان اعتراضات سے بچنے کا ہم نے ایک نیا طریقہ سوچا کہ زندگی کے ٹکڑے کر کے کہیں کہ یہ دنیا اور اس کی زندگی تمہارے لئے، اور اُخروی زندگی ہمارے لئے ——— اور پھر بار بار منبر و محراب سے دہرائیں۔ خانقاہوں اور پیرانِ طریقت کی گدیوں سے یہ آوازیں تقدس میں ڈوبی ہوئی صدائیں بن کر سنائی دیں کہ اس دنیا کی زندگی تو حقیر و ذلیل ہے۔ آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے ——— مگر جس کتابِ عظیم پر ایمان کا ہم دعویٰ کرتے ہیں وہاں تو ارشادِ باری تعالےٰ ہے کہ یہاں کا اندھا وہاں بھی اندھا اٹھایا جائیگا۔ ہم محبول جاتے ہیں زندگی کو یوں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، یہ تو اک جوئے رواں ہے ؎

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

اور ہمارا خدا تو ایمان اور اعمالِ صالحہ کے بدلے اس دنیا میں سرفرازیوں اور استخلاف فی الارض کی خوشخبری دیتا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (۲۴/۵۵)۔ مومن کی تو دعا بھی فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً سے پہلے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ہے۔

ہم حیران و سرگرداں تھے کہ ——— ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند۔ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں، ——— یہ ہمیں پرویز صاحب نے ہی بتایا کہ "اسبابِ زوالِ اُمت" کیا ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں وہ "جوئے نور" رواں دکھائی جہاں انبیائے کرامؑ کے نقوشِ پا کے طفیل ہر اک راہ کہکشاں نظر آئی۔

انہی کی چشمِ بینا نے ہمیں "برقِ طور" کی طرف راہ نمائی کی۔ اور انہی کی دوررس نگاہوں نے "شعلۂ مستور" کو چھپائے ہوئے پردوں کو ہٹایا تاکہ ہمارے ذہن اس کی اصل دیکھ پائیں ——— انہوں نے ہی عقدۂ "تقدیر" کی گتھیوں کو اپنی بصیرت سے سلجھایا۔ جس کے گنجلوں میں یہ اُمت صدیوں سے حیران و پریشان چلی آرہی تھی۔ انہی نے اقبالؒ کے لفظوں میں یہ پیغام خود آگہی دیا، کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں۔ صاحبِ اختیار و ارادہ انسان اپنی تقدیر خود بنانے پر قادر ہے۔

پرویز صاحب نے دین اور دنیا کی ثنویت کے پردے میں چھپی اس چال سے پردہ ہٹایا جو ملوکیت اور پاپائیت کی راہیں کھولتی اور مقام استوار کرتی ہے۔ انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ مذہب رسوم و عبادات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ دین ایک زندہ و پائندہ توازن بدوش معاشرے کی حسن کارانہ تخلیق کا نام ہے۔ مذہب، زندگی کو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے اور خود اس کا صرف ایک حصّہ ہے، جبکہ دین ایک نظامِ زندگی ہے جو حیات کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ زندگی کا ہر مسئلہ اپنی عقدہ کشائی کے لئے دین ہی کی کلید کا مرہونِ منّت ہے۔ (از کلیدِ دین درِ دنیا کشاد)۔

آپ نے ہی سرمایہ داری اور کمیونزم، دونوں سے حیران انسانیت کو اس نظامِ ربوبیت کی جھلک دکھائی۔ جس کے مطابق نظام قائم کرکے انسان اپنی گم گشتہ جنت کا سراغ پا سکتا ہے، ایک ایسا معاشرہ جس میں نہ کوئی بھوکا رہتا ہے اور نہ ننگا، نہ ہی بے گھر اور بے سہارا۔ جس معاشرے میں کوئی یتیم اور بے آسرا نہیں۔ ایک ایسی سوسائٹی جہاں ہر کوئی کام کرتا ہے اور بغیر کسی جبر کے، بہ رضا و رغبت، بطیبِ خاطر، کام کرتا ہے۔ اور جہاں کوئی زبردست کسی زیردست کی محنت کا ماحصل چھین کر اپنے گھر نہیں لے جا سکتا۔ جو "اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے" کا اعلان کرتا ہے۔ جو دنیا کے ہر انسان کو واجب الکریم قرار دیتا ہے اور یوں دنیا کے سب منشوروں سے زیادہ ترقی پسند منشور دیتا ہے ——— جہاں انسانی عقل کی معراج ——— عدل ——— پر ہی نہیں "احسان" پر بھی عمل ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ (WELFARE STATE) کسی تصور میں آسکتی ہے؟ اور پھر جہاں ہر کوئی، دوسرے کی ضرورت کا خیال رکھتا ہے بلکہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے۔ محنت کے ماحصل میں اتنا ہی اپنا حصہ سمجھتا ہے جتنا اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔

ان کی آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ اب مختلف گوشوں سے جو آوازیں اٹھتی سنائی دیتی ہیں وہ اسی ایک آواز کی بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ آج ہر سٹیج سے (بلا سوچے سمجھے ہی سہی) یہ کہا جا رہا ہے کہ دین مکمل نظامِ حیات ہے۔ ایسے ایسے گوشوں سے بھی یہ آواز سننے میں آرہی ہے جو نہیں سمجھتے کہ یہ مکمل نظامِ حیات ان کی موت کا پیغام ہے۔ کیونکہ وہاں زندگی میں ثنویت نہیں ہوگی اور ان کی اپنی سیادت کا دارومدار ہی اس ثنویت پر ہے۔ دین میں ملائیت اور پاپائیت نہیں ہوتی ——— آج فرقوں کے وجود کو معذرتی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ یہ ملت کو بانٹتے ہیں، تفرقہ ڈالتے ہیں اور تفرقے سے اس اُمت کو خبردار کر دیا گیا ہے۔

کل تک اُمت کی اکثریت ذاتی ملکیت کے تقدس کی قائل تھی۔ بے حدّ و حساب دولت اور ذرائع پیداوار پر انفرادی ملکیت عین اسلام بنا کر پیش کی جا رہی تھی۔ آج ملکیت کی حد مقرر کر دینے کی بات ہو رہی ہے۔ آج ہر اسٹیج سے زمین کی حدِ ملکیت مقرر کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ کل اجتماعی ملکیت غیر اسلامی تھی، آج سرکاری ملکیت میں لی گئی صنعتوں کی واپسی غیر ممکن اور غیر دانشمندانہ قدم قرار دی جا رہی ہے۔ سچ ہے۔

جادو وہ جو سر پہ چڑھ کر بولے

پرویز صاحب پر بہت سے الزام لگائے گئے۔ ان کے خلاف بہت سے فتوے دیئے گئے۔ بہت کچھ کہا گیا۔ تین نمازوں اور نوروزوں کے مضحکہ خیز جھوٹے الزامات سے لے کر منکرِ شانِ رسالتؐ تک کہا گیا۔ مگر انہوں نے حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی جگمگاتی ہوئی سیرت پر "معراجِ انسانیت" جیسی کتاب لکھ کر دنیا کو پیش کرنے کی سعادت پائی۔

بارگاہِ رسالتؐ کے تربیت یافتہ ایک عظیم انسانؐ کی سیرت "شاہکارِ رسالت" کی شکل میں دی۔ جس میں اسلام کے خلاف کی گئی عجمی سازش کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے گئے۔ خدا کی عظیم کتاب کو سمجھنے کے لئے لغات جیسی حقیقت کشا کتاب ہی مرتب نہیں کی بلکہ اس لغت کی روشنی میں پورے قرآن مجید کا مفہوم بھی سمجھایا۔

لفظ اپنے اندر کیا کیا معنی پنہاں رکھتے ہیں، اور لفظوں کو صحیح سمجھنے سے کتنی گتھیاں سلجھتی ہیں، کتنی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور کتنی راہیں آسان ہوتی ہیں، یہ پرویز صاحب کی اس عظیم کتاب ہی سے سمجھ میں آیا ——— پہلی بار پتہ چلا کہ صلوٰۃ کا مفہوم کتنا وسیع ہے۔ تسبیح سے کیا مراد ہے۔ شکر کیا ہوتا ہے۔ ذکر کسے کہتے ہیں۔ تقویٰ کیا ہوتا ہے۔ متقی کسے کہتے ہیں۔ عالم کہلانے کا حقدار کون ہے۔

میرا یہ مقام نہیں کہ میں ان عظیم فکری، ادبی اور ملّی کارناموں کی عظمت کے متعلق کچھ کہوں۔ میرا علم بڑا محدود ہے۔ اس کام کا بیڑہ تو زیادہ پڑھا لکھا انسان ہی اُٹھا سکتا ہے۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے ——— میرا تو یہ حال ہے کہ جب اپنی ایک کتاب ان کو پیش کرنا چاہی تو یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ کیا کہہ کر پیش کروں۔ آخر کہا کہ شرمندہ ہوں کہ کسے کیا پیش کر رہا ہوں؟

ایک قطرہ یا ایک لہر کی کیفیت ہی کیا کہ سمندر کو خراجِ عقیدت پیش کرے۔ مگر وہ سمندر ہی کیا جس میں وسعتِ قلب و نظر نہ ہو۔ کشادگیٔ ظرف و نگاہ نہ ہو۔ انہوں نے میری بات کا جواب دیا ؎

برآور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

اور یوں میں اپنی نگاہوں میں چھوٹا بننے سے بچ گیا۔ یہی بڑے آدمی کی نشانی ہوتی ہے، انہوں نے باوجود تبحرِ علمی کے کبھی بڑ نہیں ماری۔ لاف زنی نہیں کی۔ کبھی اپنے آپ کو (AUTHORITY) نہیں کہا۔ وہ اکثر کہتے ہیں اور اپنی کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ قرآنی آیات کا یہ مطلب و مفہوم وہ اپنی بصیرت کے مطابق بیان

کر رہے ہیں۔ یہ حرفِ آخر اور منزہ عن الخطا نہیں۔ ان کی سوچ کو انہی کی تحریر کے آئینے میں اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ "جہانِ فردا" کے پیش لفظ سے ایک اقتباس ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنی قرآنی فکر کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کے قریب آئیں اور اس پر از خود غور و فکر کریں۔ وہ اس طرح تدبر فی القرآن سے اگر کسی ایسے نتیجے پر پہنچیں جو میری فکر سے مختلف ہے تو نہ صرف یہ کہ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ میں ان حقائق پر دوبارہ غور کروں گا۔

وہ تو اس راہ پر اس لئے چلے ہیں کہ بعد کو آنے والے ان وادیوں میں آئیں تو انہیں یہ نقوشِ پا دیکھ کر ڈھارس بندھے کہ :ـ

سرخیٔ خارِ مغیلاں یہ پتہ دیتی ہے
تیرے دیوانے اِدھر آئے، یہاں تک پہنچے

انہیں یہ معلوم ہو کہ اس وادیٔ پُر خار میں پہلے بھی کوئی آبلہ پا آیا تھا۔ مایوس ہونے کی بجائے وہ ایک نئے عزم کے ساتھ نئی منزل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں۔

والسلام

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن	**بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ)** ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ) 149 SUTTON COURT ROAD, LONDON, E-13 — 9 NR. PHONE 01-552-1517.
لاہور میں ہر جمعہ ۹½ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰۰) ۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)	**فیصل آباد** میں ہر جمعہ ۲ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز (فون ۳۰۶۹۰) (عقب اڈہ لاریاں۔ مائی دی جھگی)
کراچی ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۳ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ۔ نیوچالی۔ کراچی نمبر ۲	**گوجرانوالہ** میں ہر جمعہ ۳ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت۔ گلی مدد ڈسوئی لائنز (بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن) نوٹ: درس حال ہی میں سورۃ فاتحہ سے شروع کیا گیا ہے۔
پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق لین صدر۔ بالمقابل ڈی پی آئی مین گیٹ پشاور سٹیڈیم باڑہ روڈ۔	**گجرات** میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز بروز اتوار ۳ بجے شام بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ۔ (بذریعہ ٹیپ)
مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خاں۔ نواب علی روڈ۔	**جلالپور جٹاں** میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶۔ لیاقت روڈ	**ملتان** میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۷۲۰۷۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

میرا سرمایۂ حیات

قرآنی فکر کی پچاس سالہ (گولڈن جوبلی)
کی تقریب پر پرویز صاحب کا خطاب

(۱۷ نومبر ۱۹۷۸ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرا سرمایۂ حیات

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

ہمرہانِ قافلۂ قرآنی و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت

میری طبیعی عمر پچھتر سال سے اوپر ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جو قابلِ ذکر ہو، یا کسی خصوصیت کی حامل۔ قابلِ ذکر بات صرف یہ ہے کہ اس میں قریب پچاس سال کا عرصہ ایسا ہے جو قرآن کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کے لئے وقف رہا۔ میری قرآنی فکر سے متفق احباب نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اس واقعہ کی یاد منانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کی اس معصوم سی خواہش کا احترام ضروری سمجھا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس تقریب کو (جسے وہ قرآنی فکر کی گولڈن جوبلی کہہ کر پکارتے ہیں) نہایت سادگی سے منائیں۔ آج کا یہ اجتماع اسی تقریب کا مظہر ہے۔ میرے لئے درحقیقت یہ تقریب ہے، بارگاہِ خداوندی میں سجدۂ شکرانہ بجا لانے کی جس کی فیض گستری سے مجھے یہ توفیق نصیب ہوئی کہ میری زندگی کا اتنا حصہ اُس کی کتابِ عظیم کے افہام و تفہیم میں بسر ہوا۔ اور ساتھ ہی اظہارِ تشکر اپنے ان رفقاء کا جو ان طول و طویل مسافتوں میں فکری طور پر میرے شریکِ سفر رہے۔ میرے ان احباب کا تقاضا ہے کہ میں آج کے خطاب میں ان منازل کی کچھ جھلکیاں پیش کروں جن سے گذر کر میں اس مقام تک پہنچا ہوں۔ اگرچہ میں ان نشاناتِ راہ کا جستہ جستہ تذکرہ اس سے پہلے بھی مختلف مقامات پر کر چکا ہوں، لیکن بپاسِ خاطرِ احباب انہیں مختصر الفاظ میں دُہرا دیا جاتا ہے۔ اس سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ میرے بعد اگر کوئی راہرو اس راستہ پر گامزن ہونے کا شوق اور ارادہ رکھے تو میرے نقوشِ قدم کو دیکھ کر اس کا حوصلہ بندھ جائے کہ یہ راہ نامانوس نہیں۔ اس پر اس سے پہلے بھی کوئی گذرا ہے۔

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ — یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہوگا

میری پیدائش (۹ جولائی ۱۹۰۳ء کو) ضلع گورداسپور کے مشہور قصبہ بٹالہ میں ہوئی جو اب مشرقی پنجاب کا حصہ بن چکا ہے۔ بٹالہ ویسے ہی بڑا مذہبی شہر تھا۔ پھر میری پیدائش اور تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی وہ شریعت اور طریقت دونوں کی قدامت پرستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے دادا (علیہ الرحمۃ) حنفی مسلک کے ایک جید عالم، چشتیہ خانوادہ کے ایک ممتاز صوفی اور اس کے ساتھ ہی ایک حاذق طبیب بھی تھے۔ لیکن انھوں نے ان میں سے کسی کو بھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا کیونکہ وہ اصلاح و خدمتِ خلق کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ مجھے اپنے علم اور سلوک کا وارث بنانا چاہتے تھے اس لئے چھوٹی سی عمر ہی سے میری تعلیم شروع ہو گئی۔ مجھ سے سلوک کی منزلیں کس طرح طے کرائی گئیں یہ ایک الگ داستان ہے۔ جہاں تک علومِ شریعت اور تفسیرِ قرآن مجید کا تعلق ہے ان کی تعلیم ٹھیٹھ قدامت پرستانہ انداز سے ہوئی اور میں تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے ہم سنوں سے کہیں آگے نکل گیا۔ یہ بات موجبِ صد مسرت اور باعثِ صد افتخار ہونی چاہیئے تھی لیکن مجھے ایک اور مشکل کا سامنا تھا۔ چمنستانِ فطرت میں جو شاخ میرے حصے میں آئی تھی اس پر ذہنِ رسا کے گل سرسید کے ساتھ ناقدانہ نگاہ کے کانٹے بھی پیوست تھے۔ قدامت پرستانہ اندازِ تعلیم کا تقاضہ تھا کہ جو کچھ بتایا جائے اسے اس لئے صحیح مانو کہ فلاں امام، فلاں محدث یا فلاں مفسر نے اسی طرح فرمایا ہے۔ اور میری تنقیدی نگاہ کا ردِ عمل یہ ہوتا تھا کہ صحیح تو اسی بات کو مانا جا سکتا ہے جس کے صحیح ہونے کے لئے کوئی دلیل موجود ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا سینہ شروع ہی سے اسلاف پرستی کی اندھی تقلید اور دلیل طلبی کے پامال شدہ تقاضوں کی کش مکش کی آماجگاہ بننا شروع ہو گیا۔ لیکن میری مشکل یہ تھی کہ اس زمانے میں، میں اس اندرونی کش مکش کو زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔ دادا جان (مرحوم) کا احترام گلوگیر ہو جاتا۔ اس تمام اثنا میں میری زندگی کی راتیں اور عمر کے دن اسی کش مکش میں گذر گئے۔

میرے کوائفِ حیات میں بعض ایسے واقعات سامنے آئیں گے جنہیں جس کا جی چاہے اتفاقی حوادث سے تعبیر کرلے اور جس کا جی چاہے مشیت کے پروگرام کی کڑیاں کہہ کر پکار لے۔ ان کی بہرحال کوئی توجیہہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ انہی واقعات میں ایک وہ تھا جس کا میں ابھی ابھی ذکر کروں گا اور جو میری زندگی کے دھارے کا رُخ بدلنے کا بنیادی طور پر محرک ہوا۔

علامہ اقبالؒ کا نقشِ اوّلیں

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ اقبالؒ کی پہلی مثنوی ـــ اسرارِ خودی ـــ شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے حافظ کے خلاف جو اشعار کہے تھے، ملک کے تصوف زدہ حلقوں کی طرف سے ان پر مخالفت کا طوفان کھڑا کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، میرے دادا جان بلند پایہ صوفی تھے۔ اس لحاظ سے انہیں بھی اس مثنوی کے مخالفین کی صف میں نظر آنا چاہیئے تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ انہوں نے وہ مثنوی مجھے خود پڑھائی اور اس انداز سے پڑھائی کہ علامہ اقبالؒ کے علم و فکر کی عظمت میرے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئی۔ اس کے بعد جب میں بسلسلۂ ملازمت لاہور آیا تو دادا جان نے تاکید کی کہ وہاں علامہ اقبالؒ کے ہاں حاضری دینے

رہتا۔ علامہ سے اسی ذہنی تعلق اور قلبی وابستگی کا نتیجہ تھا کہ قرآنِ مجید کے صحیح طور پر سمجھنے کا طریقہ سامنے آگیا۔ یعنی یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ:۔

۱۔ قرآن کریم اپنے آپ کو نور (یعنی روشنی) کہتا ہے اور روشنی اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی خارجی ذریعہ کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو خود دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہر شے کی اصل و حقیقت کو بھی واضح کر دیتی ہے۔

۲۔ یہ عربی مبین کی کتاب ہے اس لئے اسے اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے جب معلوم ہو کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں اہلِ عرب ان الفاظ کا کیا مفہوم لیتے تھے جو قرآن میں آئے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسے "محاورۂ عرب" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

۳۔ قرآن کسی موضوع کو تماماً اور کلیتہً ایک مقام پر بیان نہیں کرتا۔ وہ اسے مختلف مقامات پر سامنے لاتا ہے اور ہر بار باندازِ نو ——— بنابریں اس کے کسی موضوع کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے وہ تمام مقامات سامنے ہوں جہاں اس نے اس سلسلہ میں کچھ کہا ہے۔ اسے تصریفِ آیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور آخر میں یہ کہ:

۴۔ قرآنی حقائق و معارف تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ علومِ حاضرہ نے جس حد تک ترقی کی ہے وہ انسان کی نگاہ کے سامنے ہوں۔

قرآن فہمی کا طریق

قرآن کریم کے سمجھنے کا یہ طریق تو سامنے آگیا لیکن اس کے لئے جس علمی اور تحقیقاتی مواد (MATERIAL) کی ضرورت تھی، وہ کہیں نہیں ملتا تھا۔ نہ تو قرآنِ مجید کا کوئی ایسا لغت موجود تھا جس میں اس کے الفاظ (مفردات) کا وہ مفہوم دیا گیا ہو جو زمانۂ نزولِ قرآن میں مروّج اور متبادر تھا۔ اور نہ ہی تبویب کی کوئی ایسی کتاب تھی جس میں قرآنی حقائق کو اس انداز سے (CLASSIFY) کر کے یکجا کیا گیا ہو کہ ہر موضوع سے متعلق جملہ مقامات بیک وقت سامنے آجائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیضانِ اقبالؒ سے قرآن کریم کے باندازِ نو سمجھنے کی جن درخشندہ آرزوؤں نے آنکھوں میں چمک اور دل میں کیف و نشاط پیدا کر دیا تھا ایک ایک کر کے افسردہ ہونے لگیں۔ یہ واماندگی اور مایوسی کس قدر کرب انگیز تھی اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا! راستہ معلوم ہو لیکن سامانِ سفر پاس نہ ہو!!

اس پتنگے کی حقیقت کوئی ہم سے پوچھے شمع ہو سامنے پر طاقتِ پرواز نہ ہو

حضرتِ علامہؒ کے مشورہ سے میں نے اس زمانہ کے ملک کے قریب قریب تمام علماء کرام کی خدمت میں اس قسم کا لغت اور تبویب مرتب کرنے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے اس کی اہمیت کا تو اعتراف کیا لیکن اس سلسلہ میں عملاً کچھ کرنے کی کسی نے حامی نہ بھری۔ جب میں نے حضرت علامہؒ کو اس افسوس ناک حقیقت سے مطلع کیا تو انہوں نے فرمایا کہ قرآن فہمی کا شوق ہے تو یہ خارہ شگافی خود ہی کرنا ہوگی ——— تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش۔

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

میں کبھی اس کوہِ گراں کو دیکھتا تھا اور کبھی اپنے تیشۂ کند کی ہیچ مقداری اور اپنے دست و بازو کی ناتوانی کو۔ اور اس کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ جاتا تھا کہ ؎

ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

میں، ایک عرصہ تک شدّتِ اشتیاق اور احساسِ بے بسی کی اس کش مکش میں وقفِ اضطراب رہا کہ نہ معلوم وہ کیا جذبہ تھا جس سے متاثر ہو کر میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ اس طرح پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا تو شیوۂ وفا شعاری نہیں۔ تجربۃً ہی سہی، اس کی ابتدا تو کر کے دیکھو!

اور میں نے اس کوہ کنی کی ابتدا کر دی ——— بالکل بے ترتیبی سے۔ بغیر کسی پروگرام کے۔ یہ آج سے پچاس سال پہلے۔ ۱۹۲۸ء کی بات ہے۔ میں نے اس کی ابتدا تو اس طرح بے دلی سے کی، لیکن چند دنوں کے بعد یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میں قدم اٹھاتا ہوں تو سامنے کے دروازے خود بخود کھلتے جاتے ہیں۔ اور خدا کا یہ وعدہ، محسوس حقیقت بن کر وجہِ فروغِ قلب و نظر ہو رہا ہے کہ: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (۲۹/۶۹) "جو ہمارے بارے میں جدّ و جہد کرتے ہیں، ہم خود ان کی راہنمائی صحیح راہوں کی طرف کرتے چلے جاتے ہیں"۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے اس طریقِ جدید کی روشنی میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے شروع کئے جو اس زمانہ کے مشہور مجلّات۔ مثلاً، دارالمصنفین کے ماہنامہ معارف، اور دکن میں مودودی صاحب کے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوئے اور انہوں نے بڑی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس انداز سے ہمت افزائی کے سلسلہ میں ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

مولانا آزاد کی تفسیر

دنیائے علم و ادب، بلکہ جہانِ حقائقِ قرآنی میں (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کا نام بین الاقوامی شہرت کا حامل تھا۔ ملک میں ان کی تفسیر۔ ترجمان القرآن۔ کا غلغلہ پندرہ سولہ سال سے بلند ہو رہا تھا۔ ہمت شکن انتظار کے بعد ۱۹۳۱-۳۲ء میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی تو اربابِ ذوق نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سر آنکھوں پر اٹھایا۔ ملک کی ممتاز ترین علمی شخصیتوں نے اس کی مدح و ستائش کے قصیدے کہے۔ ماہنامہ مجلّات میں اس پر فلک پیما تبصرے شائع ہوئے۔ میں نے جب قرآنِ خالص کی روشنی میں، اس پر نگاہ ڈالی تو اس کا نقطۂ ماسکہ یکسر اسلام کے خلاف نظر آیا۔ انہوں نے اس میں کہا تھا کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں"۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رو سے اسلام کی انفرادیت اور افضلیت ختم ہو جاتی ہے اور یہ دیگر مذاہب کی سطح پر آ جاتا ہے۔ ہندوؤں کو اس قسم کا "برہمو سماجی" اسلام اس قدر خوش آیا کہ کانگرس نے اس کی تفسیر کا ہندی میں ترجمہ کرایا اور اس کی عام اشاعت کی۔ میں نے نامور اہلِ علم ہستیوں سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھ سے اتفاق تو کیا لیکن اس پر تنقید کی جرأت کسی نے نہ کی۔ بالآخر میں نے خود اس پر بھرپور تنقید کی۔ اور میرا مقالہ

ماہنامہ معارف کی جنوری ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا، حالانکہ اس سے قبل، خود سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے قلم سے اس میں، اس تفسیر کی تعریف میں تبصرہ شائع ہو چکا تھا۔ میری اس تنقید نے ملک کے علمی حلقہ میں ہلچل مچا دی۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ خود مولانا سے مرحوم کے معتقدین کے حلقہ میں سے بعض اہلِ علم حضرات نے مولانا سے اس تنقید کا جواب لکھنے کا تقاضا کیا اور جب انہوں نے ان کا یہ تقاضا پورا نہ کیا تو وہ ان سے ایک گونہ برگشتہ ہو گئے۔ اس واقعہ سے میری ہمت اور بھی بڑھ گئی اور میں نے اپنی تحقیق کی رفتار تیز کر دی اور تبویب کا جو سلسلہ پہلے بے ترتیبی سے شروع کیا تھا اسے ایک ربط و ترتیب کے ساتھ منضبط کرنا شروع کر دیا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ ۱۹۳۸ء تک یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا کہ قائدِ اعظمؒ کے ارشاد کی تعمیل میں ماہنامہ طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں لایا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو علماء، مذہب کے نام پر مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرتے تھے، قرآن کریم

طلوعِ اسلام

کی روشنی میں ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ اس مجلہ نے تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں۔ وہ دور میری جنون آمیز سرگرمیوں کی شدت کا تھا۔ دفتر کی ملازمت۔ طلوعِ اسلام کا باقاعدگی سے اجراء۔ مخالفینِ تحریکِ پاکستان سے چومکھی لڑائی جس کی صفِ مقابل میں ملک کے مشہور ترین علماء شامل تھے۔ دہلی اور شملہ کے مختلف مراکز میں، قرآنی موضوعات پر تقاریر اور خطابات۔ نئی دہلی کی سیکرٹریٹ کی مسجد میں خطاباتِ جمعہ میں مسلم لیگ کے اجتماعات کے ساتھ، اقبال ڈے کے نام سے تحریکِ پاکستان کی تائید میں خطابات ——— اکثر ایسا ہوتا کہ شام چار بجے تک دفتر میں ہیں۔ رات کو میرٹھ، پانی پت یا کرنال یا حصار میں اجتماعات سے خطاب ہو رہا ہے اور دوسری صبح پھر دفتر میں موجود ہیں۔ میری ان دشت پیمائیوں میں جو صاحبِ جنوں میرے ہم سفر ہوتے تھے، ان میں سے ایک، میرے برادرِ بزرگ، محترم شیخ سراج الحق آج بھی میرے ہم نفس ہیں۔ اللہ ان کی عمر اور ہمت میں برکت عطا فرمائے کہ ان کے دم قدم سے، نام روشن ہے اک اُجڑے ہوئے میخانے کا۔ اس تمام تگ و تاز میں نہ صرف میری قرآنی تحقیق کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ بلکہ ایک مستقل سلسلہ تصنیف کی ابتدا بھی ہو گئی۔ یعنی تعریفِ آیات کے طریق پر معارف القرآن کا سلسلہ۔ اس کی پہلی جلد ——— جو بڑی تقطیع کے سات سو صفحات پر مشتمل تھی۔ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی اور اہلِ ذوق نے اسے بڑی قدر کی نگاہوں سے

سلسلۂ معارف القرآن

دیکھا۔ اس کی دوسری جلد مارچ ۱۹۴۵ء میں (جو قریب پان سو صفحات پر مشتمل تھی) اور تیسری جلد قریب ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل جولائی ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت ان جلدوں کا الگ الگ نام نہیں تھا۔ بعد میں انہیں الگ الگ عنوانات سے شائع کیا گیا۔ یعنی من و یزداں، جس میں اللہ تعالیٰ کے متعلق قرآنی تصریحات ہیں۔ ابلیس و آدم، جس میں انسان۔ آدم۔ ملائکہ۔ وحی۔ رسالت۔ وغیرہ موضوعات ہیں۔ جوئے نور، جس میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے انبیاء کرامؑ

کا تذکارِ جلیلہ ہے۔ برقِ طور میں صاحبِ کلیم اور بنی اسرائیل کی داستان۔

چوتھی جلد کی تدوین کے وقت، ایک نہایت نازک اور مشکل مرحلہ سامنے آیا۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱)۔ "تمہارے لئے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے"۔ ذہن میں خیال اُبھرتا تھا کہ جس زندگی کو خدا قیامت تک کے لئے بہترین نمونہ قرار دیتا ہے، یہ کچھ بعید سا نظر آتا ہے کہ وہ اس زندگی کا نقشہ مرتب کرنے کا کام انسانوں پر چھوڑ دے۔ اسے، اس زندگی کا نقشہ خود مرتب کر کے قرآن کے آئینے میں محفوظ کر دینا چاہیئے تھا۔

معراجِ انسانیت

چنانچہ اس خیال کے تحت جب میں نے تصریفِ آیات کے انداز سے تحقیق شروع کی تو یہ دیکھ کر میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے اصولی خط و خال سب قرآن کے اندر جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان خطوط کی بنیادوں پر کتاب سیرت مرتب کی اور وہ معراجِ انسانیت کے نام سے ۱۹۴۹ء میں اشاعت پذیر ہو گئی۔ بڑی تقطیع کے قریب ۹۰۰ صفحات پر مشتمل یہ تصنیف اپنے انداز کی منفرد کتابِ سیرت تھی جسے اربابِ ذوق نے سر آنکھوں پر اٹھایا۔ میں اس توفیقِ ایزدی پر جس قدر سجداتِ تشکر ادا کروں کم ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں شعلہ مستور کے نام سے، حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات شائع ہوئے اور یوں حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکارِ جلیلہ کی داستان مکمل ہو گئی۔ یہ سلسلہ درحقیقت ان انقلابات کا تذکرہ ہے جو ان حضرات کے ہاتھوں مختلف اقوام و ملل میں برپا ہوتے رہے اور جو ظلمت کدۂ عالم میں ہمیشہ کے لئے ضیا بار رہیں گے۔ اس دوران میں، اس سلسلہ سے ہٹ کر بھی کچھ کتابیں شائع ہوئیں۔ مثلاً سلیم کے نام خطوط کی تین جلدیں۔ طاہرہ کے نام خطوط۔ اسبابِ زوالِ اُمت۔ اسلامی معاشرت وغیرہ۔

میرا ان حقیر سی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ قرآن مجید کا نام ایک کتابِ زندہ کی صورت میں فضا میں گونجنے لگا اور قوم کے نوجوان طبقہ نے اس میں جاذبیت محسوس کرنا شروع کر دی۔ ان نوجوانوں کی طرف سے ایک سوال، بنیادی طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اور وہ یہ کہ جب خدا نے انسان کو عقل و شعور کی خصوصیت سے نوازا ہے تو زندگی کے مسائل اس کی رو سے کیوں نہیں حل ہو سکتے جو ماورائے عقل سرچشمۂ علم یعنی وحی کی ضرورت لاحق ہو؟ ان کا یہ سوال ایسا نہیں تھا جسے لاحول پڑھ کر ماتھے کی تیوری سے دھتکار دیا جاتا۔ اس کا اطمینان بخش جواب میرے ذمے تھا۔ میں نے انسانی زندگی کے مسائل کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا اور حکمائے یونان سے لے کر دورِ حاضرہ تک کے مفکرین، محققین، مؤرخین، علمائے سائنس اور علم النفس کے ماہرین وغیرہ نے اس اٹھائی ہزار سال کے عرصہ میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے خود انہی کے الفاظ میں، حسنِ ترتیب کے ساتھ یکجا کیا اور "انسان نے کیا سوچا؟" کے نام سے اسے اس کتاب کی شکل میں، ۱۹۵۵ء میں شائع کیا جس نے علم و شعور کی دنیا میں فکر کے نئے چراغ روشن کر دیئے۔ اس

انسان نے کیا سوچا ؟

کتاب میں میں نے اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن جب، ایک خدا کا منکر بھی اس کتاب کو ختم کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ زندگی کے مسائل کا حل تنہا عقل کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے کسی ماورائے فکرِ انسان کا سرچشمۂ علم کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے۔ یہ کتاب قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرآن کی طرف متوجہ کرنے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔

اسی دوران میں ہمارے ملک میں ہی نہیں، ساری دنیا میں معاشیات نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی اور قدیم نظامِ سرمایہ داری اور جدید نظامِ کمیونزم یا سوشلزم میں شدید کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ ہماری قدامت پرست مذہبی پیشوائیت، نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابقِ اسلام ثابت کرنے کی سعی ناکام میں ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہی تھی ــــــ یعنی اس اسلام کے مطابق ثابت کرنے میں جو ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ تھا۔ اس کا ردِّ عمل یہ تھا کہ ہمارا نوجوان طبقہ کشاں کشاں کمیونزم کی طرف بڑھے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اس خطرہ کو محسوس کیا اور نظامِ ربوبیت

نظامِ ربوبیت

نامی کتاب میں قرآن کریم کا معاشی نظام پیش کیا جس نے اس خطرہ کے سیلاب کو مقابلے کے لیے محکم بند کا کام دیا۔ اس اہم کتاب کا تازہ ایڈیشن زیرِ طباعت ہے۔

ــــــــــــ (٠) ــــــــــــ

میں نے اس دوران میں جو قرآنی فکر اور تعلیم پیش کی اس میں ایک چیز نمایاں تھی۔ اور وہ یہ کہ اس میں قرآنی آیات کا مفہوم بالعموم مروجہ ترجموں سے مختلف تھا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ میرے پیش کردہ مفہوم کی سند کیا ہے ؟ اس کی سند تھی محاورۂ عرب۔ یعنی قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم جو زمانہ نزولِ قرآن میں لیا جاتا تھا۔ چنانچہ میری سالہا سال کی

لغات القرآن

جگر کاویوں، دیدہ ریزیوں اور اختر شماریوں کا ماحصل، لغات القرآن کی شکل میں سنہ ۱۹۶۰ء میں قوم کے سامنے آ گیا۔ قریب انیس سو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم لغت چار جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ میں، فخریہ نہیں بطور تحدیثِ نعمت، نہایت منکسرانہ انداز سے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اس نہج کا قرآن کا لغت، اردو تو ایک طرف دنیا کی کسی زبان میں بھی موجود نہیں۔ اس نے اربابِ ذوق و تجسس کے سامنے، فکرِ قرآن سے بہرہ یاب ہونے کی نئی راہیں کھول دی ہیں اور پاکستان اور بیرونِ پاکستان، اعیانِ تحقیق اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

مفہوم القرآن

اسی دوران میں، میں اس لغت اور تبویب کی رو سے، قرآن مجید کا مفہوم بھی مرتب کئے جا رہا تھا۔ چنانچہ الحمد سے والناس تک پورے قرآن کریم کا مفہوم، تیس پاروں کی شکل میں مفہوم القرآن کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور اربابِ ذوق کی تشنگی کی تسکین بہم پہنچانے کی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ اس مفہوم نے اربابِ فکر و دانش

کو قرآن مجید کے عام ترجموں اور تفسیروں سے بے نیاز کر دیا ہے۔

لغات القرآن کی تدوین کے سلسلہ میں ایک چھوٹا سا واقعہ گوش گذار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس لغت کے شائع ہونے کے بعد ایک دن ایک عراقی عالم مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ حکومتِ پاکستان کے رابطہ عوامی کے ایک افسر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اس نے کہا کہ عراقی علماء کی ایک تنظیم قرآن مجید کا لغت مرتب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے چاہا ہے کہ جہاں جہاں قرآن کا لغت مدون کرنے کا کام ہوا ہو یا ہو رہا ہو، ان حضرات سے مل کر اس سلسلہ میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اسی سلسلہ میں مجھ سے ملنے آئے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ تنظیم کونسی ہے جس کے زیرِ اہتمام تمہارے لغت کی تدوین کا کام شروع کیا گیا۔ وہ جماعت کن علماء پر مشتمل تھی جس نے اس لغت کو مرتب کیا۔ اس کی تکمیل میں کتنا عرصہ لگا۔ اس پر کس قدر خرچ اٹھا۔ اس کی اشاعت کا انتظام کس نے کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی نہ جماعت۔ نہ کوئی مالی ذرائع تھے نہ مادی اسباب۔ یہ سب کچھ میں نے تنہا کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ تمام کتابیں بھی تصنیف اور شائع کی ہیں جو آپ کو ان الماریوں میں نظر آ رہی ہیں۔ وہ صاحب خندۂ زیرلبی سے یہ سب کچھ سنتے رہے۔ میں کسی کام کے لئے گھر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایکا ایکی اٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت طنزیہ انداز سے علیک سلیک کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں! ان کا یہ انداز اور اقدام ایسا ناقابلِ فہم تھا کہ ان سے اس کی وجہ دریافت کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ کچھ دنوں بعد، رابطہ عوامی کے اس افسر سے جو ان کے ساتھ آئے تھے سرِ راہ میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ اس دن بات کیا ہوئی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ اندر گئے ہیں تو ان صاحب نے کہا کہ یہ شخص بالکل غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص تنہا اتنا کام کر لے۔ سو جب یہ اصلی بات بتانا نہیں چاہتا تو اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میں یہ سن کر مسکرایا اور ان سے کہا کہ خیر گذری میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس دوران میں میں نے تیس سال سرکاری ملازمت بھی کی ہے۔ (اس نے اُسے یہ بتا دیا تھا)

وہ عراقی عالم سچا تھا ——— وہ تو ایک طرف، اگر کوئی خود مجھ سے پوچھے کہ تم نے اس بے سروسانی کے عالم میں، یہ سب کچھ تن تنہا کس طرح کر لیا تو میں بھی اس کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکوں! اس کے متعلق اگر میں کچھ کہہ سکوں تو (اقبال کے الفاظ میں) فقط اتنا کہ:۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اور اس کے بعد عشق کی اس ندی کی روانیاں بدستور جاری رہیں۔ ۱۹۶۸ء میں میری انگریزی زبان میں پہلی تصنیف (ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION) شائع ہوئی جس نے پاکستان کے انگریزی دان طبقہ کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے اربابِ دانش و بینش کو اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس کرایا۔ اس سے قرآن کی مہرِ عالمتاب کی شعاعیں دور دور تک پھیل گئیں اور پھیلتی جا رہی ہیں۔ ۱۹۶۹ء

میں "جہانِ فردا" کے نام سے آخری زندگی کے متعلق ایک کتاب شائع ہوئی جسے یوں کہئے کہ وہ سلسلۂ معارف القرآن کی آخری کڑی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں "مذاہبِ عالم میں مبینہ آسمانی کتابیں" شائع ہوئی۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآنِ مجید کے سوا کوئی ایسی مبینہ آسمانی کتاب نہیں جسے غیر محرف کہا جا سکے۔ ۱۹۶۴ء میں ایک اور اہم کتاب ـــــ اسلام کیا ہے؟ ـــــ کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں "کتاب التقدیر" شائع ہوئی جس نے تقدیر جیسے پیچ در پیچ مسئلہ کو اس حسن و خوبی سے حل کر کے رکھ دیا کہ جس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اس کا قلب مطمئن ہو گیا۔ اور ۱۹۷۳ء میں میری عمر بھر کی ایک آرزو کی تکمیل اس کتاب کی اشاعت سے ہوئی جس کا نام شاہکارِ رسالتؐ ہے اور جس میں اسلامی نظام کا وہ نقشہ سامنے آگیا ہے جس سے اس کی تکمیل عہدِ فاروقی میں ہوئی تھی۔ معراجِ انسانیت کے ساتھ یہ کتاب بھی میرے لئے باعثِ ہزار سعادت ہے۔ محترم شورش کاشمیری (مرحوم) نے اس کتاب کا صرف ایک باب پڑھنے کے بعد اپنے اخبار چٹان (بابت ۱۳ مئی ۱۹۷۴ء) میں لکھا تھا کہ:

> اس عظیم کتاب کو پڑھنے کے بعد ایڈیٹر چٹان کو یقین ہو چکا ہے کہ اپنی اس کتاب کی بدولت پرویز بارگاہِ رسالتؐ میں سرخرو ہو کر باریاب ہوں گے اور یہ کتاب ان کیلئے توشۂ آخرت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان فضلائے اُمت کے ساتھ جگہ دیں گے جن کے دل اسلام کے لئے ہر دور میں دھڑکتے رہے ہیں۔

اور اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا "پرویز افکارِ اسلامی کی کربلا میں حسینی قافلہ کی ایک آواز ہیں۔ علماء کو ان سے متعلق اپنا فتویٰ واپس لینا چاہیئے۔"

۱۹۷۴ء میں تحریکِ ختمِ نبوت میں نیا ولولہ بیدار ہوا تو میری کتاب "ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کا پس منظر معلومات افزا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں، بہاول نگر کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں تصفیہ طلب امر یہ تھا کہ احمدیوں کا شمار مسلمانوں میں کیا جا سکتا ہے یا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ نو سال تک یہ مقدمہ زیرِ سماعت رہا اور مسلمانوں کی طرف سے جید علماء کرام نے اس کی پیروی کی لیکن بات کسی ٹھکانے نہ لگی۔ ۱۹۳۵ء میں وہاں کے ڈسٹرکٹ جج، محمد اکبر (مرحوم) نے اس کا فیصلہ صادر کیا جس میں لکھا تھا کہ نو سال تک یہ مسئلہ زیرِ بحث رہا کہ مقامِ نبوت کیا ہے لیکن بات واضح نہ ہو سکی۔ اتفاقیہ ایک دن میں نے ایک رسالہ میں چودھری غلام احمد پرویز کا ایک مضمون پڑھا جس سے یہ سارا مسئلہ حل ہو گیا اور مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ احمدیوں کا شمار مسلمانوں میں نہیں کیا جا سکتا ـــــ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، یہ پہلا عدالتی فیصلہ تھا جس میں احمدیوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا گیا تھا۔

اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا تھا کہ "نبوت کی جو حقیقت انہوں نے (پرویز صاحب نے) بیان کی ہے میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس سے انکار بھی نہیں ہو سکتا۔" (ص ۱۰)۔

لیکن یہ فیصلہ اُس وقت قانونی حیثیت حاصل نہ کر سکا۔ ۱۹۷۴ء میں، میں نے انہی قرآنی شواہد پر مبنی یہ کتاب شائع کی۔ مقامِ تشکر ہے کہ پاکستان کی پارلیمان نے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیدیا اور میری سالہا سال کی محنت ثمر بار ہوئی۔

(۰)

میں سمجھتا تھا کہ لغات القرآن اور مفہوم القرآن شائع ہو جانے کے بعد میرے سر سے ذمہ داریوں کا بوجھ اُتر جائے گا لیکن میرا یہ احساس خوش فہمی پر مبنی ثابت ہوا۔ میری قرآنی فکر سے مستفید ہونے والے احباب نے تقاضا کیا کہ مفہوم کے بعد مجھے، مجادرۂ عرب اور تصریف آیات کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر بھی مرتب کرنی چاہیئے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری بھی مجھے قبول کرنی پڑی اور تفسیر قرآن کی پہلی جلد مطالب الفرقان کے نام سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۹۷۶ء میں۔ تیسری جلد زیرِ کتابت ہے اور چوتھی جلد زیرِ تسوید۔ یہ تفسیر قرآنی روشنی کے عام کرنے میں نمایاں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

اور آخر میں ایک اور حاصلِ عمر کا تذکرہ۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، میں نے تصریف آیات کے اصول کی بنیاد پر تبویب کا کام ۱۹۲۷ء میں شروع کر دیا تھا لیکن بے ترتیبی کے ساتھ۔ اس کے بعد، ۱۹۳۵ء سے اسے ربط و ترتیب کے ساتھ منضبط کرنا شروع کیا۔ احباب کا تقاضا تھا کہ اس بنیادی

تبویب القرآن

کاوش کے ماحصل کو بھی شائع کر دینا چاہیئے۔ لیکن میرا ارادہ تھا کہ یہ تکمیل تک پہنچ جائے تو اسے شائع کیا جائے۔ لیکن بعد میں میں نے خود محسوس کیا کہ قرآن تو بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اس کے متعلق حرفِ آخر شاید دنیا کے آخری انسان کے حصے میں آئے گا۔ لہٰذا میں احباب سے متفق ہو گیا کہ جتنا کچھ ہو چکا ہے اسے شائع کر دینا چاہیئے تاکہ یہ محفوظ بھی ہو جائے اور اس کی افادیت بھی عام ہو جائے۔ بنا بریں سال گذشتہ انہی دنوں، تبویب القرآن تین ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر احباب کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور میں نے بارگاہ ربّ العزت میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس کے بعد قوانین قرآنی کا ایک جامع مجموعہ الگ بھی شائع کرایا۔

اس سلسلۂ تصنیف و تالیف کے ضمن میں میں نے ان متعدد کتابوں کا ذکر نہیں کیا جو [redacted] کے مجموعوں کی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ نہ ہی ان تالیفات کا جو ادارہ کی طرف [redacted] ہیں اور جو اکثر و بیشتر میری تحریروں پر مشتمل ہیں۔ علاوہ ازیں میں [redacted] دراز کا بھی ذکر نہیں کیا جو کراچی میں ۱۹۵۳ء سے باقاعدہ شروع [redacted] ہیں ہفتہ وار جاری ہے۔ نہ ہی صدہا مستفسرین کے استفسارا [redacted] کتابت بھی ہے، اور ملاقاتیں بھی۔

یہ ہے عزیزانِ من! فکرِ قرآنی کی طلب و جستجو کی [redacted] پچاس سال میں گذر کر اس مقام پر پہنچا ہوں۔

(۰)

اس کے بعد میں اس سوال کی طرف آنا چاہتا ہوں جو آپ کے دل میں رہ رہ کر اُبھر رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے اور نہ ہی میں نے کوئی نیا فرقہ پیدا کیا ہے۔ نہ ہی میرا واسطہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی میں عملی سیاست میں حصہ لیتا ہوں۔ تو پھر میری اس قدر مخالفت کیوں ہوتی ہے؟ ——— اور مخالفت بھی ایسی شدید کہ شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں مذہب کا نام لیا جاتا ہو اور پرویز کو گالیاں نہ دی جاتی ہوں۔ یہ بات واقعی باعثِ حیرت ہے اور اس کی وجہ کا سمجھ لینا ضروری۔

میری مخالفت کی وجہ

حضور نبی اکرم کی اس قدر شدید مخالفت ہوتی تھی کہ بعض اوقات ان لوگوں کی ناشائستہ حرکات سے حضورؐ کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے۔ ایک مقام پر اللہ تعالےٰ نے یہ کہہ کر آپ کو تسلّی دی کہ: قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (6/33) "ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ تیرے خلاف جو کچھ کہتے ہیں تو اس سے دل گرفتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ تجھے جھوٹا نہیں کہتے۔ یہ آیاتِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں"۔ میں بلا تشبیہ اور بلا تمثیل عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ یہ لوگ میری مخالفت نہیں کرتے۔ کتاب اللہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ فی الظاہر یہ چیز عجیب سی دکھائی دے گی، لیکن ہے یہ حقیقت۔

آپ، حضرات انبیاء کرامؑ ——— یعنی حضرت نوحؑ سے لے کر حضور خاتم النبیینؐ تک ——— کی ان داستانوں کو دیکھئے جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جب اور جہاں بھی کسی نبی نے خدا کی وحی پیش کی اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ یہ مخالفت اس شخص کی نہیں ہوتی تھی جو خدا کی وحی پیش کرتا تھا، یہ مخالفت اس وحی کی ہوتی تھی جسے وہ پیش کرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا تھا؟ یہ اس لئے کہ خدا کی وحی (کتاب) ہر اس نظام کو مٹانے کے لئے آتی تھی جو انسانوں کا وضع کردہ ہوتا تھا اور اس کی جگہ خدا کے متعین کردہ نظام کو مسلّط کرنے کی دعوت دیتی تھی۔ انسانوں کے وضع کردہ نظام کے ساتھ خاص گروہوں کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ ان گروہوں کو تین متمیز شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) اربابِ حکومت، جو اپنی مرضی کے مطابق قوانین بناتے اور احکام صادر کرتے ہیں۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے سیکولر نظام کہا جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ (۲) سرمایہ دار طبقہ، جو دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرتا ہے اور (۳) مذہبی پیشوائیت، جو عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے کہ اربابِ حکومت یا سرمایہ
خدا کی شریعت کے عین مطابق ہے، لہٰذا ان کے خلاف کوئی قدم اُٹھانا
مول لینا ہے۔ کتابِ خداوندی کی مخالفت میں اربابِ حکومت یا
نہیں آتا۔ وہ پیچھے رہتے ہیں اور اربابِ شریعت آگے آتے ہیں فرعون
سامنے نہیں آیا تھا۔ اس نے ہامان کو آگے کیا تھا۔ ان لوگوں کے
لئے ایک ہی حربہ ہوتا ہے۔ وہ ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ
تمہارے اسلاف کے عقائد اور مسلک سے برگشتہ کرنا
میں جھونک دو، پھانسی کے تختے پہ لٹکا دو۔ سورۂ بقرہ

ہیں ہے۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا
عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۲/۱۷۰) "جب
ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب کا اتباع کرو تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے اسلاف
کی روش پر ہی چلتے جائیں گے۔ وہ کبھی اس کے پرکھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھیں گے کہ ان کے اسلاف کی یہ روش
عقل و فکر اور ہدایتِ خداوندی کے مطابق بھی ہے یا نہیں"۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ یہ انداز کسی خاص قوم
کا نہیں۔ دنیا میں جب اور جہاں بھی پیغام خداوندی کو پیش کیا گیا وہاں کے مفاد پرستوں نے یہ کہہ کر
اُسے رد کر دیا کہ: إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ (۴۳/۲۳)
"ہم نے اپنے اسلاف کو ایک مسلک پر چلتے پایا ہے ہم انہی کا اتباع کئے جائیں گے" یہ ہی۔ اگر
کش مکش جسے قرآن کریم نے ہر رسول کے ضمن میں مسلسل بیان کیا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ اکر کس طرح
کش مکش اپنی انتہا تک پہنچ گئی۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ لایا ہے۔ رہیں اس
جو نظام خداوندی متمکن ہوا تھا کچھ عرصہ کے بعد وہ باقی نہ رہا (کن وجوہات ایسی مثال پیش کرنے پر
متعلق میں متعدد مقامات پر تفصیل سے بتا چکا ہوں) اس کی جگہ انسانی دانشور جن کے ذہن کو مذہب
لے لی ——— ملوکیت کا سیکولر نظام۔ سرمایہ داری اور نہ خود سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں
سلسلہ ختم ہو چکا تھا اس لئے انسانوں کے خود ساختہ نظاموں کو ترک کیا تھا اور جس پر عمل پیرا ہو کر ہیں
کے لئے کسی نبی نے نہیں آنا تھا۔ البتہ جو کتاب حضورؐ پر نازل کو بے نقاب دیکھا ہے ——— یعنی
دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کے بعد اس کتاب کے مطابق نامور سائنس دان ہے، جس کا نام ہے،
محمدیہ کے افراد کی طرف سے دی جائے گی۔ آپؐ سے پہلے سرجن ہے۔ حال ہی میں اس کی کتاب شائع
کر جاتا تو اس کے مخالفین اس کا پیچھا نہیں کرتے تھے۔ نیکی THE BIBLE QU یہ کتاب
نے جماعتِ مؤمنین کی ہجرت کے بعد، نہ صرف یہ کہ اسے منگوائی ہے جو یہ اپنے انداز کی ایک منفرد

نظامِ خداوندی کی مخالفت

پیدا ہو گئی۔ انسان کے لئے خوشگوار امیدوں کی خاطر پیش
طرف حضورؐ گہرا مطالعہ کیا کہ اس میں مظاہر فطرت کے متعلق
متمکن ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز نتائج کے اثرات دو ا اس کے خلاف، یہ دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی
ان کا نظام ٹھہر نہیں سکے گا۔ اس لئے ان کی انتہائی کو بنی پر مبنی ہے۔ اس سے لامحالہ میں اس نتیجے
پائے۔ ہمارے دور میں کتاب اللہ کے مطابق نظام مسلمانوں ہے تو پھر وہ خدا (معاذ اللہ) بڑا ہی جاہل ہے
نے سوچا کہ ایسے نظام کا قیام کسی ایسے خطہ زمین پر ہو سکتی۔ زمانہ قبل از تہذیب کے انسانوں
اس کے لئے انہوں نے ایک جدید خطہ زمین کے حد
کے لئے عملی کوشش کی۔ اب آپ کی سمجھ میں یہ بات
کے ارباب شریعت کی طرف سے خاص طور پر
کے مخالف ضرور تھے لیکن وہ مسلمانوں کی الگ آتا

AMERICAN TRUST PUBLICATIO

مسلمان اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا دعویٰ ترک کر دیں تو ہم تقسیم ملک کی مخالفت نہیں کریں گے۔ وہ تو اتنا کہہ کر پیچھے ہٹ جاتے تھے لیکن مسلمانوں کے اربابِ مذہب اس کی مخالفت میں پیش پیش رہتے تھے۔ یہ وہی کتاب اللہ کی مخالفت تھی جو حضرت نوحؑ کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد نہ یہاں علامہ اقبالؒ موجود تھے، اور نہ ہی قائداعظمؒ زیادہ دنوں تک زندہ رہے۔ میں نے تحریکِ پاکستان میں اس لئے حصہ لیا تھا کہ اس مملکت کو کتاب اللہ کے مطابق نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کیا جا رہا تھا۔ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی عدم موجودگی میں، میں نے اپنا فریضہ سمجھا کہ

یہ کہہ کر آپ اِصْبِر | اپنی اس پکار کو جاری رکھوں کہ یہاں نظامِ مملکت، کتاب اللہ (قرآن مجید) کے
یٰبُنَیَّ تُبُوْنَکَ | مطابق متشکل ہونا چاہیئے۔ میری اس دعوت کی مخالفت ہونی لازمی تھی۔ اس

تیرے خلاف جو کچھ کہتے اربابِ اقتدار اور سرمایہ پرست طبقہ تھا لیکن تاریخ کی سنتِ جاریہ کے مطابق اس خداوندی کو جھٹلاتے ہیں۔" ثابت ہی تھی۔ اس سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ مخالفت میری نہیں۔ یہ اس نظام نہیں کرتے۔ کتاب اللہ کی مخالفت کر مطابق قائم کرنے کی طرف میں دعوت دیتا ہوں۔

آپ حضرات انبیاء کرامؑ ——— یعنی حضطرے کی طرف دوبارہ توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کی رو سے کو دیکھئے جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں۔ آپ سعلاقہ میں بھی بار آور ہوگیا تو اس کے نتائج بڑے دور رس ہوں گے۔ اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ یہ مخالفت اس شخذ رسل و رسائل عام نہیں تھا، آج سارا کرۂ ارض یوں کہئے کہ دہی کی ہوئی تھی جسے وہ پیش کرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کسی ایک گوشے کی تحریک کے اثرات زلزلے کے جھٹکے کی طرح اس نظام کو مٹانے کے لئے آئی تھی جو انسانوں کا وضع کردہ، آج دنیا بھر کی قومیں اس سے خائف ہیں کہ پاکستان مسلّط کرنے کی دعوت دیتی تھی۔ انسانوں کے وضع کردہ کی طرف دعوت کی مخالفت میں دنیا کی تمام قومیں، ہوتے ہیں۔ ان گروہوں کو تین متمیز شقوں میں تقسیم کیا ہی خواہش اور کوشش ہے کہ یہاں قرآنی نظام نافذ مطابق قوانین بناتے اور احکام صادر کرتے ہیں۔ دور رہا خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ (۲) سرمایہ دار طبقہ، جو میری قرآنی دعوت کی مخالفت کا سبب ہے نہ افسوس ہے نہ اور (۳) مذہبی پیشوائیت، جو عوام کو اس فریب سے افسوس اس کا ہے کہ اس مخالفت میں یہ حضرات خدا کی شریعت کے عین مسے کام لے رہے ہیں۔ آپ ہر محراب و منبر سے یہ آواز سول لیتا ہے۔ کتنا تین نمازوں اور نور روزوں کا پرچار کرتا ہے۔ یہ اردو نہیں آتا۔ وہ پیچھے چھوٹ دیتا ہے۔ اس لئے ایک نیا فرقہ پیدا کر لیا ہے۔

سامنے نہیں آیا تھا۔

لئے ایک ہی حرف میں سے کوئی بات بھی نہیں کہتا بلکہ جو لوگ ایسا تمہارے اس حضرات کے اس جھوٹے پراپیگنڈے کا مقصد یہ ہیں جھونک، پیچھے دولت کے انبار ہیں اور معلوم نہیں کون وبائی امراض کے جراثیم کی طرح اس طرح معمور

کر رکھا ہے کہ آپ کسی کے سامنے پرویز کا نام لیجئے وہ جھٹ سے کہہ دے گا کہ ہاں، ہاں! وہی پرویز جس نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ جو تین نمازوں اور نو روزوں کا فتنہ برپا کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کا پرویز کا محض نام سننے سے یہ ردِعمل ہو وہ پرویز کے پیش کردہ قرآنی نظام کی بات سننے کے لئے کب تیار ہوگا؟

لیکن میں اس سے دل برداشتہ نہیں ہوں۔ خدا کا دعویٰ ہے کہ اس "الدین" یعنی قرآنی نظام کو آخرالامر انسانوں کے تمام خود ساختہ نظاموں پر غالب آکر رہنا ہے۔ اور قرآن کریم کو اسی مقصد کیلئے ابدی طور پر محفوظ رکھا گیا ہے۔ خدا نے کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی قوم اس کتاب سے اعراض برتے گی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کتاب اپنے مشن میں ناکام رہ جائے گی۔ کوئی دوسری قوم اس کی علمبردار بن جائے گی۔ اگر وقت ہوتا تو میں بتاتا کہ اقوامِ عالم اپنے خود ساختہ نظاموں کے پیدا کردہ جہنم سے تنگ آکر کس طرح غیر شعوری طور پر اس نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں جسے قرآن میں متعین کیا گیا ہے۔ (میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں) میں اس وقت صرف آپ کے سامنے ایک ایسی مثال پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ دنیا کے وہ دانشور جن کے ذہن کو مذہب نے مفلوج نہیں کر دیا کس طرح قرآنی حقائق کو اس انداز سے از خود سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں جسے قرآن نے تجویز کیا تھا اور جس پر عمل پیرا ہو کر میں نے ان حقائق کو بے نقاب دیکھا ہے ——— یعنی

ایک غیر مسلم سائنسدان کی تحقیق

محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات کے مطابق۔ فرانس کا ایک مشہور سائنس دان ہے، جس کا نام ہے، (MAURICE BUCAILLE) وہ ایک ممتاز سرجن ہے۔ حال ہی میں اس کی کتاب شائع ہوئی ہے۔ (THE BIBLE QURAN AND SCIENCE) یہ کتاب ابھی پاکستان میں نہیں پہنچی۔ میں نے براہِ راست انگلینڈ سے منگوائی ہے[1] یہ اپنے انداز کی ایک منفرد کتاب ہے اور میرے نزدیک بڑی اہمیت کی حامل اور نوعِ انسان کے لئے خوشگوار امیدوں کی طلائع پیش رس۔ اس نے لکھا ہے کہ میں نے اس نگاہ سے بائیبل کا گہرا مطالعہ کیا کہ اس میں مظاہرِ فطرت کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سائنس کے انکشافات کے مطابق ہے یا اس کے خلاف، یہ دیکھ کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ اس میں جو کچھ اس باب میں کہا گیا ہے جہالت اور توہم پرستی پر مبنی ہے۔ اس سے لامحالہ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر (جیسا کہ ہم سے منوایا جاتا ہے) یہ خدا کی کتاب ہے تو پھر وہ خدا (معاذ اللہ) بڑا ہی جاہل ہے اور اگر خدا علیم و بصیر ہے تو پھر یہ کتاب خدا کی نہیں ہو سکتی۔ زمانۂ قبل از تہذیب کے انسانوں کی پریشاں خیالیوں کا مجموعہ کہلا سکتی ہے۔

---

[1] کتاب کے پبلشرز ہیں۔

AMERICAN TRUST PUBLICATIONS, INDIANAPOLIS, U.S.A.

اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ میں نے سوچا کہ یہودیت اور عیسائیت کے بعد دنیا کا ایک بہت بڑا مذہب اسلام بھی ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ جس کتاب کو اس مذہب کے پیرو منزل من اللہ کہتے ہیں اس باب میں اس کی کیا کیفیت ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں اسلام کا معتقد نہیں، میں نے ایک سائنسدان کی حیثیت سے خالصتہً علمی نقطۂ نگاہ سے اس کتاب کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا تھا اور وہ بھی علوم سائنس کی حد تک۔ سائنس میں بھی میں نے ان مسائل کو نہیں لیا جو ہنوز نظریات میں شمار ہوتے ہیں، صرف ان انکشافات کو لیا جو حقائق (FACTS) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

اس نے کہا ہے کہ میں عربی زبان نہیں جانتا تھا اس لئے لامحالہ مجھے قرآن کے تراجم کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ جہاں تک اہم حقائق کا تعلق ہے کوئی ایک ترجمہ دوسرے سے نہیں ملتا اور جہاں تک سائنس کے انکشافات کا تعلق ہے، تفاسیر بیشتر رطب و یابس کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر ریسرچ کا شوق ہے تو پھر اس کتاب کا براہِ راست مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کیلئے ضروری ہے کہ عربی سیکھی جائے اور عربی بھی جدید نہیں بلکہ وہ قدیم عربی جس میں قرآن نازل ہوا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے، عزیزانِ من! آپ سوچئے کہ اس شخص کی نگاہ کتنی دور تک پہنچی اور اس نے کس طرح اس حقیقت کو پالیا کہ قرآن مجید محاورۂ عرب کی رو ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ عربی سیکھنے کیلئے خود عرب پہنچا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں اس کی شاہ فیصل (مرحوم) سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

عربی زبان پر اس قدر دسترس حاصل کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ اسے اس کا بھی اطمینان حاصل کرنا چاہیئے کہ جو کتاب آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جسے پیغمبر اسلامؐ نے اپنی امت کو دیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب کا ایک پورا باب اس تحقیق کی نذر کیا ہے اور اس کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ کتاب بالکل غیر محرف ہے اور بلا شائبہ تشکیک اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود۔ اس تحقیق کے دوران وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ یہ خدا کی کتاب ہے اس لئے نہ اس کتاب کو محمدؐ کی کتاب کہنا چاہیئے، نہ اسلام کو محمدؐ کا دین۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ مغربی مستشرقین کی سازش تھی جو انہوں نے مسلمانوں کو

محمدؐ نہ نام

(MOHAMMADAN) اور اسلام کو (MOHAMMADANISM) کہنا شروع کر دیا۔ اور حیرت ہے کہ خود مسلمان بھی اس فریب میں آ گئے۔ محمدؐ نے کہیں دعویٰ نہیں کیا کہ اسلام ان کا وضع کردہ دین ہے۔

اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ میں نے سائنس کے ان ثابت شدہ حقائق کو لیا جن کا تعلق تخلیق کائنات، فلکیات، ارضیات، نباتیات، حیاتیات اور خود انسانی تخلیق اور جنین کی پیدائش سے ہے، اور ان موضوعات کے متعلق قرآن کی ورق گردانی شروع کی۔ میں نے دیکھا کہ قرآن کا یہ انداز نہیں کہ وہ ایک موضوع پر ایک ہی مقام پر سب کچھ کہہ دے۔ وہ اس کے متعلق مختلف مقامات پر بیان

کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوا کہ میرے پیش نظر موضوعات کے متعلق قرآن میں جہاں جہاں کچھ آیا ہے اسے الگ مدوّن کیا جائے۔ چنانچہ اس طرح اس نے قرآن کے ان حصوں کی تبویب کی۔

آپ نے غور فرمایا کہ محاورۂ عرب کے بعد یہ وہ دوسرا بنیادی طریق ہے جسے قرآن کریم نے قرآن فہمی کے لئے خود تجویز کیا ہے اور جس پر میں پچاس سال سے کاربند چلا آ رہا ہوں۔ یہ ریسرچ سکالر آج تک مجھ سے نہیں ملا، اور جہاں تک میرا خیال ہے، میری کوئی کتاب بھی اس کی نظر سے نہیں گذری ہوگی۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے قرآن فہمی کا یہ انداز مجھ سے مستعار لیا ہے۔ یہ انداز خود قرآن نے تجویز کیا ہے اور جو شخص بھی آزادانہ قرآن پر غور کرے گا اس کے سامنے یہ طریق خود بخود آ جائے گا۔

اس کدو کنی کے بعد وہ قرآنی سرچشمہ سے جوئے شیر لانے کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ وہ سائنس کی کسی ایک ثابت شدہ حقیقت کو لے کر اس سے متعلقہ آیات کو سامنے رکھتا ہے اور پھر آیت کے الفاظ کے معانی بنیادی عربی زبان کی رو سے متعین کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ ان معانی کی رو سے قرآن میں پیش کردہ حقیقت کس طرح سائنس کے انکشافات کے عین مطابق ہے۔ وہ ایسے مقامات پر یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے قدیم مفسرین تو معذور تھے کہ وہ قرآن کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکے کیونکہ ان کے زمانے میں علم انسانی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، لیکن مجھے افسوس آتا ہے دورِ جدید کے مترجمین اور مفسرین پر کہ وہ بھی آنکھیں بند کئے اسی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں۔ وہ موجودہ دور کے تراجم کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

> ان تراجم میں اس قسم کی فاش غلطیاں کیوں پائی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ قدیم زمانہ کے مفسّرین نے جو کچھ کہہ دیا یہ لوگ بلا تحقیق اسی کو سند تسلیم کئے چلے جا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق تو یہ عذر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک لفظ کے متعدد مفاہیم میں سے، اُس خاص مفہوم کا انتخاب نہیں کر سکتے تھے جو قرآن میں بیان کردہ سائنٹیفک حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن اب سائنس کے انکشافات نے اس مسئلے کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ لہٰذا اب ضرورت ہے کہ انسانی علوم کی روشنی میں ان تراجم اور تفاسیر پر نظرِ ثانی کی جائے۔ (ص ۱۱۸)

وہ ایک ایک آیت کو لیتا ہے۔ اس طریق سے اس کا مفہوم متعین کرتا ہے۔ اس کے بعد بتاتا ہے کہ سائنس کے جدید ترین انکشافات کس طرح اس مفہوم کی تائید کرتے ہیں اور اس کے بعد وجد و کیف کے عالم میں مجھوم کر کہتا ہے کہ اے دنیا کے دانشورو! خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ کیا آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی فکر کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اس قسم کی حقیقت بیان کر سکتا؟ ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس زمانے میں کوئی انسان یہ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا نہ کہہ سکتا۔ اس حقیقت کے بعد ہمارے لئے یہ تسلیم کرنے میں کونسا امر مانع ہو سکتا ہے کہ اس علم کا سرچشمہ ماوراء عقلِ انسانی ہے۔ وہ ایک

مقام پر بائیبل اور قرآن کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

ان موضوعات کے متعلق جہاں بائیبل میں بے شمار غلطیاں پائی جاتی ہیں، قرآن میں مجھے اس قسم کی کوئی ایک غلطی بھی نہیں ملی۔ ایسے مقامات پر کھڑے ہو کر مجھے سوچنا اور اپنے آپ سے یہ سوال کرنا پڑا کہ اگر قرآن کا مصنّف کوئی انسان تھا تو اس کے لئے کیسے ممکن تھا کہ وہ سائنس کے ان حقائق کو ساتویں صدی عیسوی میں پیش کر سکتا جن کا انکشاف اس دور میں آکر ہوا ہے۔ جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بلاشک و شبہ وہی ہے جسے پیغمبرِ اسلام نے دنیا کو دیا تھا، لہٰذا اس میں بعد کے کسی ردّ و بدل، اضافہ یا آمیزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا عقلِ انسانی اس کی کوئی توجیہ پیش کر سکتی ہے کہ اس زمانے میں ایک انسان نے یہ کچھ کیسے معلوم کر لیا؟ میں تو اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتا۔ (ص ۱۲۰)

اس سے ذرا آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:-

جو کچھ میں نے تحقیق کیا ہے وہ لامحالہ انسان کو اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ یہ بات ناقابلِ تصوّر ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کا ایک انسان، متنوع حقائقِ کائنات کے متعلق جو اس زمانے میں انسانوں کے سامنے آئے ہی نہیں تھے ایسی باتیں کہہ دے جو چودہ سو سال کے بعد کہیں جا کر بے نقاب ہوئی ہوں۔ بنا بریں میں تو قرآن کے متعلق یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہو سکتا ہے۔ (ص ۱۲۵)

ایک مقام پر وہ کہتا ہے کہ:-

اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جو اُن کے زمانے سے آگے تھیں لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے ہاں رطب و یابس کا ملغوبہ ہے۔ جہاں ایک بات صحیح ملتی ہے تو ننانوے باتیں اُس دور کی اوہام پرستی پر مبنی ہوتی ہیں۔ لیکن قرآن کی یہ حالت نہیں۔ اس میں بے شمار ایسے حقائق کا ذکر ملتا ہے جن کا تعلق عصرِ حاضر کے علوم سے ہے لیکن ان میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی تردید دورِ حاضرہ کے سائنٹیفک انکشافات نے کی ہو۔ یہ ہے فرق، انسانی مفکّرین کی دور نگہی اور قرآن کے تبیانِ حقیقت میں! (ص ۱۶۳)

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ قرآن کسی انسان کی فکر کی تخلیق نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا نابغہ کیوں نہ ہو۔ میرے سینے میں رہ رہ کر یہ خواہش ابھرتی ہے کہ میں چند آیات کے متعلق اس محقق کے پیش کردہ مفہوم کی کچھ مثالیں پیش کروں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ وقت کی قلّت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ قرآنِ کریم میں اجرامِ فلکی کے متعلق کہا گیا ہے کہ: كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۲۱/۳۳) شیخ الہند مولانا محمود الحسن اس کا ترجمہ کرتے ہیں "سب اپنے اپنے گھر میں پھرتے ہیں"۔ باقی

تراجم بھی قریب قریب اسی نہج پر ہیں۔ یہ سکالر کہتا ہے کہ یہ تراجم قرآن میں بیان کردہ حقیقت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے اور اسی لئے علم الافلاک کے ماہرین انہیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ زمانۂ نزولِ قرآن کی عربی زبان کی رو سے لفظ فلک کے معنی "گھر" نہیں۔ بلکہ وہ گول دائرہ ہے جس میں کوئی متحرک شے پھرتی ہو۔ آج کی اصطلاح اس کا صحیح ترجمہ (ORBIT) بامدار ہوگا۔ دوسرا لفظ ہے۔ "یَسْبَحُوْنَ" اس کا مفہوم گھومنا پھرنا نہیں۔ عرب اسے، پانی میں تیرنے والے اور خشکی پر دوڑنے والے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ چونکہ اجرامِ فلکی خشکی پر نہیں دوڑتے، خلا میں متحرک رہتے ہیں اس لئے ان کے لئے "تیرنے" کا لفظ زیادہ قریب الفہم ہے۔ لیکن اس میں ایک اور بڑا لطیف اور نہایت اہم نکتہ بھی پوشیدہ ہے۔ پانی پر تیرنے والی مچھلی ہو یا خشکی پر دوڑنے والا گھوڑا، انہیں کوئی خارجی قوت متحرک نہیں رکھتی۔ وہ اپنے زورِ دروں سے متحرک رہتے ہیں۔ لہٰذا سَبْحٌ کے معنی ہوئے "اپنی اندرونی قوت سے متحرک رہنا"۔ اس اعتبار سے قرآنی آیت کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۲۱/۳۳) کا مفہوم یہ ہے کہ "تمام آسمانی کرّے اپنے اپنے مدار میں خود اپنے زورِ دروں سے مصروفِ گردش ہیں"۔ اس مفہوم کے بیان کرنے کے بعد وہ دنیا کے دانشوروں سے یہ سوال کرتا ہے کہ کیا اس زمانے میں جب فیثاغورث جیسے مفکر کا یہ نظریہ مبنی برحقیقت سمجھا جاتا تھا کہ سورج ساکن ہے اور کائنات کا مرکز، کیا کوئی انسان وہ بات کہہ سکتا تھا جسے قرآن نے ان چار لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے؟ اس قسم کے دلائل و شواہد کے بعد وہ بار بار اعلان کرتا ہے کہ قرآن کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہو سکتا۔

میں نے اس کتاب کا تعارف اس تفصیل کے ساتھ یہ کہنے کے لئے کرایا ہے کہ ہمیں اپنے ہاں کے حالات کو دیکھ کر، اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں ہو جانا چاہیئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، اقوامِ عالم اپنے نظامِ معاشرہ سے تنگ آ کر ایک نئے نظام کی تلاش میں ہیں اور وہاں کے دانشوروں کا ذہن قرآن مجید کو اس کی اپنی روشنی میں سمجھنے کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس کی ابتداء اس کے حقائق کو سمجھنے سے کی ہے۔ جب وہ آگے بڑھ کر اس کے نظام کی طرف آئیں گے تو اسے بھی بے نقاب دیکھ لیں گے اور بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ یہ وہی نظام ہے جس کی تلاش میں ہم حیران و سرگرداں پھر رہے تھے۔ دنیا کی مثالی فلاحی مملکت سویڈن کی ہے۔ (WELFARE STATE) وہاں کے ممتاز ماہر معاشیات (GUNNER MYRDAL) نے، فلاحی مملکت کے نتائج سے مایوس ہو کر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (BEYOND THE WELFARE STATE) اس میں وہ ایک ایسے نظام کا تصور پیش کرتا ہے جس میں انسان کو فی الواقعہ فلاح اور بہبود حاصل ہو جائے۔ اس کی تفصیل دینے کے بعد وہ لکھتا ہے:

تصوراتی نظام

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض کے نقشے پر کھینچی ہوئی ممالک کی

لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہو گی جس میں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے۔ رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہو گی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔

یہ دنیا انہیں قرآن کریم کے پیش کردہ نظام میں ملے گی۔ اس کا امکان انہی قوموں میں زیادہ روشن نظر آتا ہے اس لئے کہ وہ قدامت پرستانہ مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے آزاد ہو چکی ہیں یا آزاد ہو رہی ہیں۔ میں قرآن کریم کی اس حقیقت کو ایک عرصہ سے پیش کئے چلا آ رہا ہوں، اور اب، اسے پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ خدا کا نظام جو اس کی کتاب میں محفوظ ہے اسی قوم کے ہاں رائج ہو سکے گا جو مذہبی پیشوائیت کے زیر اثر نہ ہو۔ مذہبی پیشوائیت نے نہ کبھی پہلے کتاب اللہ کے مطابق نظام قائم ہونے دیا ہے نہ اب قائم ہونے دے گی۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ قرآنی نظام میں نظامِ سرمایہ داری کی طرح مذہبی پیشوائیت کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ سو ظاہر ہے کہ جس نظام میں خود ان کا وجود باقی نہ رہے، وہ اسے کس طرح نافذ ہونے دیں گے۔

قرآن کے راستے میں روک

قرآن مجید نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ..... (۹/۳۴) "اے جماعتِ مومنین! اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ احبار و رہبان (علماء اور مشائخ) کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریق سے کھا جاتے ہیں۔ وہ اسی صورت میں ایسا کر سکتے ہیں کہ ملک میں نظامِ خداوندی نافذ نہ ہو۔ اس لئے یہ اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے رہتے ہیں۔" مملکتِ پاکستان اس لئے حاصل کی گئی تھی کہ اس میں قرآنی نظام نافذ کیا جا سکے۔ آپ اس مملکت کی تیس سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات کس طرح اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہیں۔ آج کل اس مملکت کو اسلامی بنانے کے نعرے بڑے زور شور سے بلند کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اقامتِ دین۔ اسلامی نظام۔ نظامِ شریعت۔ نظامِ مصطفےٰ۔ قوانینِ شریعت وغیرہ اصطلاحات ہر گلی کوچے میں سننے میں آئیں گی لیکن قرآنی نظام کے الفاظ آپ کو کہیں سنائی نہیں دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب قرآنی نظام کہا جائے گا تو اس میں کسی غیر قرآنی نظریہ یا مسلک کی گنجائش نہیں ہو گی۔ اس کے برعکس جب اسلامی نظام یا نظامِ شریعت وغیرہ کہا جائے گا تو اس میں وضعی روایات کی رو سے نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت جیسے خلافِ اسلام مسالک عین مطابقِ اسلام قرار دیئے جائیں گے ——— "اسلام میں بے حد و نہایت ذاتی ملکیت" کے جواز،

اور" علماء کو انبیاء بنی اسرائیل کے مماثل" قرار دینے کی سند، وضعی روایات کی رو ہی سے مل سکتی ہے۔ قرآن سے نہیں۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ مذکورہ صدر فرانسیسی محقق (BUCAILLE) کی نگہ ژرف بیں نے اس حقیقت کو بھی پالیا۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب کے آخری باب کو قرآن۔ بائبل اور ہماری روایات کے تقابل کے لئے مختص کیا ہے اور کہا ہے کہ وضعی روایات اور بائبل ایک ہی سطح پر ہیں۔

بہرحال، میں کہ یہ رہا تھا کہ جہاں مذہبی پیشوائیت کا اثر غالب ہوگا وہاں قرآنی نظام بار نہیں پا سکے گا۔ ہمارے ہاں اس نظریہ پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام میں دین خود سیاست ہے، اس لئے اس میں ان کے الگ الگ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جس مقصد کے لئے یہ حضرات اس سلوگن کو عام کرتے ہیں وہ کچھ اور ہے۔ اسلام میں اس نظریہ کا مطلب یہ تھا کہ فیصلے کتاب اللہ کے ہوں گے اور حکومت ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ اس لئے سیاست دین سے الگ نہیں ہوگی۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ فیصلے ان حضرات کے ہوں گے اور حکومت ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ یہ وہ مقیاکریسی ہے جسے ختم کرنے کے لئے قرآن نازل ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں"۔ اور ان حضرات کا ارشاد ہے کہ جو لوگ ان کے فیصلوں کو نہیں مانتے وہ کافر ہیں۔ قرآنی نظام میں حکومت خدا کی ہوتی ہے۔ ان کے نظام شریعت میں مذہبی پیشوائیت کی۔

دین و سیاست

ان حضرات کی کافرسازی کی داستان بڑی طویل ہے، قلتِ وقت جس کی اجازت نہیں دیتی۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ اس وقت پاکستان میں جتنے فرقے ہیں ان میں سے ہر ایک فرقہ، پر دوسرے فرقوں کی طرف سے کفر کے فتوے لگ چکے ہیں اس لئے ان فتووں کی رو سے پاکستان میں کوئی بھی مسلمان نہیں۔ اور اس کے باوجود ان فرقوں کے نمائندے نظام مصطفیٰ قائم کرنے کے مدعی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ اس وقت ان میں نمایاں مفتی محمود اور مودودی صاحب ہیں۔ ۱۹۶۹ء کا ذکر ہے۔ مفتی صاحب نے حیدرآباد پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

> مودودی نے جمیعت العلماء کے مولویوں کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔ مودودی کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں۔ فتویٰ دینے کا حق مجھے ہے..... میں آج اس پریس کلب میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی گمراہ۔ کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اس کے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے۔ وہ امریکہ اور سرمایہ داروں

کا ایجنٹ ہے۔ اب وہ موت کے آخری کنارے پہنچ چکا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔

(ہفت روزہ زندگی لاہور۔ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۶۹ء)

اب وہی مفتی صاحب، مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے ساتھ مل کر نظام مصطفےٰ قائم کرنے کا دعویٰ فرما رہے ہیں! حالانکہ انہوں نے کہا یہ تھا کہ مودودی صاحب بھی کافر ہیں اور ان کی جماعت سے تعلق رکھنے والا بھی کافر۔

ان سے آگے بڑھئے تو مفتی صاحب اور نورانی صاحب ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور نورانی صاحب حرمین الشریفین کے اماموں کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے۔ اور یہ سب نظام مصطفےٰ قائم کرنے کے مدعی ہیں! میرا جرم یہ ہے کہ میں انکے یہ عقائد اور مسالک قوم کے سامنے لاتا رہتا ہوں۔ یہی میری مخالفت کی وجہ ہے۔

(۰)

مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جب صورتِ حالات یہ ہے کہ پاکستان میں قرآنی نظام کے قیام کے امکانات پہلے سے بھی زیادہ بعید ہو گئے ہیں، تو تم نے اپنی عمر بھر کی کاوشوں سے حاصل کیا کیا؟

میری ذمہ داری

ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ اس خطۂ زمین کو قرآنی نظام کی آماجگاہ بننے کیلئے حاصل کیا گیا تھا۔ میں نے یہ اپنا فریضہ سمجھا کہ قوم کو بتاؤں کہ قرآنی نظام کیا ہے اور اسے یہاں کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔ میرا فریضہ اس حقیقت کو عام کرنا تھا۔ میری یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ میں اس نظام کو قائم کر کے رہوں۔ یہ ذمہ داری تو خدا نے حضورؐ نبی اکرم پر بھی عائد نہیں کی تھی کہ وہ اس نظام کو اپنی زندگی میں قائم کر کے رہیں۔ ایک دفعہ حضورؐ کے دل میں یہ خیال ابھرا کہ کیا یہ نظام میری آنکھوں کے سامنے متشکل ہو جائے گا یا میری ساری عمر اسی تگ و تاز میں بسر ہو جائے گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) ایسا آپ کی زندگی میں ہو گا یا آپ کے بعد، آپ کو اس کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ کا فریضہ اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ایسا ہو گا کب؟ سو جب اس نظام کا اپنی زندگی میں قائم کرنا حضورؐ کی بھی ذمہ داری نہیں تھی تو حضورؐ کے اس خاکِ پا کی کیا حیثیت ہے؟ میرا فریضہ اپنی بساط کے مطابق اس پیغام کو عام کئے جانا ہے۔ یہ نتیجہ خیز کب ہو گا، اس کی (WORRY) کرنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ یہ ہے میری سعی و کاوش کی کیفیت۔ اور یہ تھا میرا فریضہ جسے میں ادا کئے چلا آ رہا ہوں ؎

وفا خطا تھی! خطائیں نے زندگی بھر کی اب اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی

علاوہ ازیں یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآنی نظام کسی خاص قوم یا خاص خطۂ زمین کا پابند نہیں۔ قرآن تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ یہ مہرِ عالمتاب ہے۔ جو قوم بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھے گی اس کی روشنی سے مستنیر ہو جائے گی۔ اس کتاب کے بھیجنے والے نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ: لَا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ۔ (٢٤/٣٥) اس میں مشرق اور مغرب کی کوئی تخصیص نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

کوئی اور قوم!

اللہ تعالیٰ نے تو قرآن کی سب سے پہلی مخاطب قوم سے کہہ دیا تھا کہ: وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ۔ (٤٧/٣٨)۔ اگر تم نے اس قرآن سے اعراض برتا تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گی اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ مسلم اقوام کے قرآن سے اس اعراض کو دیکھ کر، علامہ اقبالؒ نے انتہائی درد اور گداز سے کہا تھا کہ: ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی از زمان و از مکاں آمد غنی!
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا ست احتیاجِ روم و شام او را کجا ست
حق اگر از پیشِ ما بردارَدش پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند
(جاوید نامہ)

علامہ اقبالؒ نے ان احساسات کا اظہار آج سے قریب پچاس سال پہلے کیا تھا اور اس سے ان کی جانِ حزیں پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے اور ہماری موجودہ حالت کو دیکھتے تو معلوم وہ کیا کہتے اور ان کی جانِ حزیں پہ کیا بیتتی! بہرحال، اللہ کا وعدہ ہے کہ قرآنی نظام کو تمام نظامہائے عالم پر غالب آکر رہنا ہے۔ اگر یہ سعادت ہمارے حصے میں نہیں آتی، تو دنیا کی کوئی اور خوش بخت قوم اس سے بہرہ یاب ہوگی۔

مجھ سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تمہارا لٹریچر اگر انگریزی زبان میں منتقل ہو جائے تو ان قوموں کیلئے قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ میں اس سے متفق ہوں لیکن میرے سامنے ایک اور پروگرام ہے جو میرا سارا وقت لے لے گا۔ اس لئے میں اس طرف توجہ نہیں دے سکوں گا۔ اگر کوئی اور صاحب یا جماعت اس کام کا بیڑہ اٹھا لے تو اس کے نتائج بہت دوررس ہوں گے۔ میں خود بھی اس نہج پہ سوچ رہا ہوں۔

میں نے قرآن فہمی کی جو طرح ڈالی ہے اگر کوئی اور صاحبِ ذوق اسی راہ پہ گامزن ہونا چاہیں تو اپنے تجربہ کی بنا پر انہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس راہ میں دو چار ذرا سخت مقام آتے ہیں۔ ان سے محتاط رہنا

راستے کے خطرات

ازبس ضروری ہے سب سے پہلی اور بنیادی احتیاط یہ کہ دل میں پہلے سے کوئی خیال لے کر یا عقیدہ قائم کر کے قرآن کی طرف نہیں آنا چاہیئے۔ ایسا کرنا شرک ہوگا اور شرک عدالتِ خداوندی میں ناقابلِ معافی جرم ہے۔ کلمہ طیبہ میں الا اللہ سے پہلے لا الٰہ کے معنی ہیں کہ انسان ہر قسم کے نظریات، تصوّرات، اعتقادات، مسالک و مشارب کو دل سے الگ کر کے خدا کی طرف آئے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ قرآن کبھی سمجھ میں نہیں آسکے گا بلکہ قلب و دماغ اس قسم کی گمراہیوں کی آماجگاہ بن جائیں گے جو انسان کو منزلِ مقصود سے بہت دور لے جائیں گی۔ اقبالؒ نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا تھا کہ: ؎

رہ مدہ اقبال را در کعبہ اے شیخِ حرم　　ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو اپنے قریب نہ آنے دیں جو آپ کے پیغام کے کما حقہٗ سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور اسے غلط سمجھیں لیکن باہر جا کر اس غلط مفہوم کو آپ کی طرف منسوب کر کے عام کرتے جائیں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ قرآنی پیغام کو اتنا نقصان اس کے دانا دشمن نہیں پہنچاتے جتنا نقصان اس کے اس قسم کے "نادان دوست" پہنچاتے ہیں۔ یہ خطرہ ایسا مہیب ہوتا ہے کہ اقبالؒ کو اس کیلئے خدا سے خاص طور پر التجا کرنی پڑی کہ ؎

مئے من از تنک جاماں نگہ دار　　شرابِ پختہ از خاماں نگہ دار!
شرر از نیستانے دور تر بہ　　بخاصاں بخش و از عاماں نگہ دار

عزیزانِ گرامی قدر! میں نے اپنی قرآنی فکر کی طول طویل مسافت کی مختلف منزلوں کی مختصر الفاظ میں نشاندہی کر دی ہے۔ اس کا شکریہ بدرگاہِ ربّ العزت باقی ہے لیکن خدا کا شکریہ ادا کرنے سے پہلے اس کے مخلص بندوں کا شکریہ میرے ذمہ ہے۔ میرے اس سفر کی کیفیت یہ تھی کہ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر　　راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

دعائیں

یہ ان مخلص ہمراہانِ سفر کی رفاقت تھی جس نے نہ صرف یہ کہ مجھے اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں ہونے دیا بلکہ میری ہمت اور حوصلہ بھی بڑھاتے رہے۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کا اس سے زیادہ حسین انداز اور کونسا ہو سکتا ہے کہ میں ان کیلئے خدائے بزرگ و برتر سے دعا کروں کہ الٰہ العالمین! تیرے ان بے ساز و برگ بندوں نے بڑے صبر اور استقامت سے اس جادۂ پرخطر میں میرا ساتھ دیا اور ہر قسم کی مصیبتوں اور مشکلوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا ہے۔ اپنے بندوں کو لا نضیع اجر المحسنین کی نشید جانفزا سے نوازنے والے! تو قافلۂ قرآنی کے ان جادہ پیماؤں کو شرفِ انسانیت کی درخشندہ منزل تک پہنچا دے کہ کاروانِ حیات کیلئے اس سے زیادہ گرانمایہ متاع کوئی اور نہیں۔ یہی وہ متاع ہے جس کے تصوّر سے یہ الفاظ بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں کہ ؎

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر　　اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں نے شروع ہی سے اپنی قرآنی فکر کا مخاطب قوم کی نئی نسل کے نوجوانوں کو قرار دیا ہے کہ قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ میرے اوّلین مخاطب بھی یہی تھے اور اب اس منزل پر پہنچ کر یہ دعا بھی انہی کیلئے ہے کہ اے خدائے کرم گستر!

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں　　میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز　　مری خلوت و انجمن کا گداز!
امنگیں مری آرزوئیں مری　　امیدیں مری جستجوئیں مری!
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر　　اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے　　لٹا دے! ٹھکانے لگا دے اسے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ　　والسلام